عظمتِ مومن

عجیب لوگ

ایران حضرت عمر فاروق کے زمانۂ خلافت میں فتح ہوا ہے۔ اس وقت ایران کی مسلم افواج کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص تھے۔ اس جنگ میں ایرانیوں کا کافی نقصان ہوا۔ چنانچہ انہوں نے گفت وشنید کی پیش کش کی۔ حضرت سعد نے مختلف وفود کو رستم اور یزدگرد کے دربار میں بھیجا۔ مثلاً نعمان بن مُقرن۔ فرات بن حیان۔ حنظلہ بن ربیع۔ عُطارد بن حاجب۔ اشعث بن قیس۔ مغیرہ بن شعبہ۔ عمرو بن معدیکرب کے وفود (البدایہ والنہایہ) ۷/۳۸۔۳۹

تاریخ میں ان سفارتوں کی کافی تفصیلات آئی ہیں۔ آخری مرحلہ میں حضرت مغیرہ کا وفد شہنشاہ یزدگرد کے زرق برق دربار میں آیا۔ مدائن کے محل میں انہوں نے انتہائی بے خوفی کے ساتھ تقریر کی۔ یزدگرد اس کو سن کر بگڑ گیا۔ اس نے کہا کہ تم میرے سامنے اس طرح کی باتیں کرتے ہو۔ اگر یہ قاعدہ نہ ہوتا کہ ایلچی قتل نہ کئے جائیں تو میں تم کو ضرور قتل کر دیتا۔ اب تم واپس جاکر اپنے امیر کو بتا دو کہ میں سپہ سالار رستم کی سرکردگی میں ایسا لشکر بھیجنے والا ہوں جو تم سب کو قادسیہ کے خندق میں دفن کر دے گا۔

پھر یزدگرد نے محل کے آدمیوں سے کہا کہ ایک ٹوکری میں مٹی بھر کر لاؤ۔ مٹی لائی گئی تو اس نے مسلمانوں کے وفد سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ تم میں سب سے زیادہ شریف کون ہے۔ وفد کے افراد چپ رہے۔ اس کے بعد عاصم بن عمرو بولے کہ میں سب سے زیادہ شریف ہوں۔ یزدگرد نے حکم دیا کہ مٹی کی ٹوکری عاصم بن عمرو کے گلے میں لٹکائی جائے اور ان کو یہاں سے بھگا دیا جائے یہاں تک کہ وہ مدائن کے باہر چلے جائیں۔

شاہی حکم کے مطابق مٹی کی ٹوکری عاصم بن عمرو کے گلے میں لٹکا دی گئی۔ وہ اس کو لے کر مدائن کے محل سے نکلے اور اونٹنی پر سوار ہو کر تیزی سے قادسیہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں حضرت سعد بن ابی وقاص مقیم تھے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے حضرت سعد کو ساری روداد سنائی اور مٹی کی ٹوکری ان کے سامنے رکھ دی۔ اس کے بعد مسلم سردار نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

ابشروا فقد واللہ اعطانا اللہ اقتالید ملکھم و تفاءلوا بذالک اخذ بلادھم

خوش ہو جاؤ۔ کیونکہ خدا کی قسم اللہ نے ہمیں ان کے اقتدار کی کنجیاں دیدی ہیں۔ اور انھوں نے اس سے ان کے ملک پر قبضہ کی فال لی۔

یہ مسلمان اگر مٹی پاکر غصہ ہوتے تو ان کے حصہ میں نفرت اور شکایت کے سوا کچھ نہ آتا۔ مگر جب وہ غصہ نہیں ہوئے تو مٹی دینے کا واقعہ ان کے لئے ملک دینے کے ہم معنیٰ بن گیا۔ ایک انتہائی ناخوشگوار واقعہ سے بھی انھوں نے اپنے لئے یقین اور حوصلہ کی غذا حاصل کرلی۔

یہی موجودہ دنیا میں ترقی اور کامیابی کا راز ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر شخص اور ہر گروہ کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اس آزادی نے موجودہ دنیا کو مقابلہ (Competition) کی دنیا بنادیا ہے۔ یہاں ہر آدمی دوسرے آدمی کی کاٹ میں ہے۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کو دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔

ایسی حالت میں ایک صورت یہ ہے کہ آدمی غصہ اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو۔ وہ انتقامی نفسیات میں جلتا رہے۔ ایسے آدمی کا ذہن ہمیشہ منتشر رہے گا۔ وہ کبھی گہری منصوبہ بندی نہ کرسکے گا۔ ایسے آدمی کے لئے موجودہ دنیا میں ناکامی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچائے۔ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہو۔ ایسے آدمی کا ذہن ہمیشہ اعتدال کی حالت میں رہے گا۔ وہ اپنے منفی اور مثبت پہلوؤں کو کسی کمی بیشی کے بغیر جان لے گا۔ اس کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ تمام حقیقتوں کو نگاہ میں رکھے اور حالات کے عین مطابق منصوبہ بندی کرے۔ ایسے شخص کے لئے کامیابی اتنی ہی یقینی ہے جتنا رات کے بعد سورج کا نکلنا۔

جو شخص اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچائے اس کی سوچ نہایت اعلیٰ سوچ بن جاتی ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ امکانات پر ہوتی ہے۔ وہ مٹی کی ٹوکری میں پورے ملک کی تصویر دیکھ لیتا ہے۔ حوصلہ شکنی کے واقعات اس کے ذہنی خانہ میں داخل ہوکر حوصلہ مندی کے واقعات بن جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو شکست کو فتح میں تبدیل کرتے ہیں۔ وہ ناکامی میں کامیابی کا راز دریافت کرلیتے ہیں۔

تاریخ کی آواز

حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانہ میں ۱۴ھ میں ایران فتح ہوا۔ اس زمانہ میں لوگوں کے ذہن پر ایرانی شہنشاہ کی اتنی عظمت تھی کہ حضرت عمرؓ اس مہم کی سربراہی کے لیے خود مدینہ سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگیے۔ مگر لوگوں نے اس کے خلاف مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک صحابی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو اس مشکل مہم کا سپہ سالار بنایا گیا۔

اس مہم کا آخری معرکہ قادسیہ کے قریب ایک میدان میں ہوا۔ یہاں میدان جنگ کے کنارے ایک قدیم شاہی عمارت تھی۔ حضرت سعدؓ اس کی چھت پر چڑھے اور میدان کی طرف رخ کرکے تکیہ کے سہارے بیٹھ گیے۔ وہ جنگ میں خود شریک نہیں ہوئے۔ اپنی جگہ خالد بن عرفطہ کو میدان مقابلہ کا سردار مقرر کیا۔ حضرت سعد عمارت کے اوپر بیٹھے ہوئے مسلسل جنگ کا مشاہدہ کررہے تھے اور حسب ضرورت اپنی ہدایات پرچی پر لکھ کر خالد بن عرفطہ کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔

یہ جنگ اسلامی تاریخ کی انتہائی ہولناک جنگ تھی۔ اس جنگ میں ایرانی ہاتھیوں کی فوج لائے تھے جن کا اس سے پہلے عربوں نے تجربہ نہیں کیا تھا۔ ایک موقع پر ہاتھیوں کی کالی آندھی نے مسلمانوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ حضرت سعد یہ دیکھ کر بے تاب ہوگیے اور بار بار کروٹیں بدلنے لگے۔ حضرت سعد کی اہلیہ سلمیٰ جو اس وقت ان کے پاس تھیں، یہ دیکھ کر بول اٹھیں "کاش آج مثنیٰ ہوتا"۔ حضرت سعد نے سلمیٰ کو تھپڑ مار کر کہا۔ "مثنیٰ ہوتا تو وہ کیا کرلیتا"۔ سلمیٰ نے جواب دیا۔ "سبحان اللہ، بزدلی کے ساتھ غیرت بھی"۔ سلمیٰ نے یہ بات اس لیے کہی کہ حضرت سعدؓ خود لڑائی میں شریک نہیں تھے۔

اس کے بعد تاریخ لمبی تفصیل بیان کرتی ہے کہ کس طرح مسلمانوں نے ایران کی فوجی تیاریوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر شاندار فتح حاصل کی۔

اس جنگ میں ایرانیوں کا سردار رستم تھا۔ رستم کو ہلال نامی ایک مسلمان سپاہی نے قتل کیا۔ اگرچہ فردوسی نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ رستم کا مقابلہ حضرت سعد سے ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے شاہنامہ میں لکھا ہے:

زیک سوئے رستم زیک سوئے سعد

حضرت سعدؓ کے براہِ راست جنگ میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت فوج کے اندر کافی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ایرانیوں کی شکست کے بعد ایک مسلمان فوجی نے نظم کہی جس کے دو اشعار یہ تھے :

وَقَاتَلْتُ حتی اَنْزَلَ اللهُ نَصْرَهٗ   وَسَعْدٌ بِبَابِ الْقَادسِيَةِ مُعْصِمُ
فَاُبْنَا وَقَدْ اٰمَتْ نِسَاءٌ كَثِيْرَةٌ   وَنِسْوَةُ سَعْدٍ لَيْسَ فِيْهِنَّ اَيِّمُ

میں لڑا یہاں تک کہ اللہ نے اپنی مدد بھیجی۔ اور سعد قادسیہ کے دروازے سے پیٹے رہے۔ پھر ہم واپس ہوئے اور بہت سی عورتیں بیوہ ہو چکی تھیں۔ اور سعد کی بیویوں میں سے کوئی بیوی بیوہ نہیں ہوئی۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نہایت جلیل القدر صحابی تھے۔ وہ اسلام کے بڑے بڑے مجاہدوں میں شامل تھے۔ لیکن مذکورہ واقعہ کو اگر اس کی ظاہری صورت میں لیا جائے تو ایک شخص یہ رائے قائم کرے گا کہ نعوذباللہ وہ ایک بزدل آدمی تھے۔ انھوں نے دوسروں کی عورتوں کو بیوہ بنایا اور خود اپنی بیوی کے ساتھ شاہی قلعہ میں محفوظ بیٹھے رہے۔

مگر یہ شبہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ اصل واقعہ کو ادھوری شکل میں دیکھا جائے۔ واقعہ کو پوری شکل میں دیکھیے تو یہ شبہ باقی نہ رہے گا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کو عرق النسار کی بیماری تھی (كان به عرق النسا يومئذ، البدايہ والنہایہ ۷/۴۱) ایرانی جنگ کی ابتدا میں وہ ٹھیک حالت میں تھے۔ چنانچہ قادسیہ کے آخری معرکہ سے پہلے دوسری جنگوں میں وہ براہ راست شریک رہے۔ مگر قادسیہ کے معرکہ کے موقع پر ان کو عرق النسار کا شدید دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس وقت چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے۔ اس بنا پر مقابلہ میں براہِ راست شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر ان کے جنگی تجربات اور ان کی اعلیٰ ذہانت کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ان کو بدستور سپہ سالاری کے عہدہ پر باقی رکھا۔ اگرچہ وہ عملی طور پر جنگ میں شریک نہ تھے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی رہنمائی اور ان کی منصوبہ بندی ہی کی وجہ سے اس معرکہ کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا۔

ان کی جنگی ذہانت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے عین معرکہ کے وقت ایران کی ہاتھیوں کی فوج کا حل دریافت کیا جس نے کالی آندھی کی طرح مسلمانوں کو روندنا شروع کر دیا تھا۔ عرب ذہن کے لیے یہ بالکل ایک نیا مسئلہ تھا اس لیے وہ اس کا حل سوچنے سے عاجز ہو رہے تھے۔ حضرت سعدؓ نے یہ کیا کہ ان ایرانیوں کو بلایا جو پہلے پارسی تھے اور اب مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے نام ضخم اور سلم وغیرہ تاریخوں میں آئے ہیں۔

حضرت سعدؓ نے ان ایرانی نومسلموں سے پوچھا کہ اس کالے طوفان کا کیا علاج ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا حل یہ ہے کہ کسی طرح ان کے سونڈ اور ان کی آنکھیں بے کار کر دی جائیں۔

اس کے بعد حضرت سعد نے مسلم فوج سے کچھ خاص جوانوں کو طلب کیا۔ ان کو پوری بات سمجھائی اور ان کو ابھارا کہ تم جان پر کھیل اس مہم کو سر کرو۔ چنانچہ قعقاع اور کچھ دوسرے جوانوں نے دو ہاتھیوں کو منتخب کیا۔ یہ دونوں ہاتھی جسامت میں سب سے بڑے تھے اور بقیہ ہاتھیوں کے لیے سردار کا کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہاتھی کا نام ابیض تھا اور دوسرے کا نام اجرب۔ مسلم جوانوں نے ان دونوں ہاتھیوں کو نرغے میں لے لیا۔ انھوں نے نہایت پھرتی سے برچھا مار کر ان کی آنکھوں کو بے کار کر دیا۔ اس کے بعد سونڈ پر اتنے زور سے تلوار ماری کہ وہ کٹ کر الگ ہو گئی۔ اب دونوں ہاتھی پیچھے کی طرف بھاگے۔ ان کو دیکھ کر بقیہ ہاتھی بھی ان کے ساتھ مڑکر پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔ ہاتھیوں کی جو فوج پہلے مسلمانوں کو روند رہی تھی اس نے انتہائی بے دردی کے ساتھ خود ایرانی فوج کو روند ڈالا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کے مذکورہ واقعہ میں دو بہت بڑے سبق ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کے خلاف کوئی بات سامنے آئے تو آدمی کو کبھی ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس کو فوراً مان لے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معاملہ کی پوری جانچ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اصل بات اس سے بالکل مختلف تھی جو بظاہر ابتدائی رپورٹ سے سامنے آئی تھی۔ جس خبر میں کسی کے خلاف بدگمانی کا پہلو ہو اس کو مکمل تحقیق کے بغیر مان لینا سراسر ایمانی تقاضے کے خلاف ہے۔

دوسرا سبق وہ ہے جس کا ثبوت قادسیہ کے موقع پر عرب فوجیوں نے دیا۔ انھیں اپنے سردار سے زبردست شکایت تھی۔ حتیٰ کہ اس شکایت کا اظہار انھوں نے اشعار کی صورت میں کیا اور وہ اشعار تمام فوجیوں کے درمیان پھیل گیے۔ اس کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ لوگ اپنے سردار سے بغاوت کر دیں یا جنگ میں بے جگری کے ساتھ نہ لڑیں۔ سردار سے شکایت کے باوجود وہ اپنا فرض بھرپور طور پر ادا کرتے رہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو تاریخ بناتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ مزاج نہ ہو وہ صرف یہ کریں گے کہ آپس میں لڑ بھڑ کر بنتے ہوئے کھیل کو بگاڑ دیں اور ایک جنگ جو جیت پر ختم ہونے والی تھی اس کو شکست اور ناکامی میں تبدیل کر دیں۔

ایک باپ

اموی خلیفہ مروان بن الحکم نے اپنے بعد علی الترتیب عبد الملک اور اس کے بعد اپنے بھائی عبد العزیز کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا۔ مروان کے بعد عبد الملک حکمراں ہوا تو اس کی نیت بگڑ گئی جلد ہی بعد عبد العزیز کا انتقال ہوگیا۔ اب عبد الملک کو موقع مل گیا۔ اس نے ولید اور سلیمان کی ولی عہدی پر بیعت لینے کے لئے صوبوں کے حاکموں کے نام فرمان جاری کر دئے۔ ہشام بن اسماعیل مدینہ کا حاکم تھا۔ سعید بن المُسَیِّب (۹۴-۱۳ھ) جو سید التابعین کہے جاتے ہیں، اس وقت مدینہ میں موجود تھے۔ ہشام نے چاہا کہ سب سے پہلے حضرت سعید بن المسیب سے بیعت لے۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر انھوں نے بیعت کر لی تو اس کے بعد تمام اہل مدینہ بیعت کریں گے۔

سعید بن المسیب نے بیعت سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک خلیفہ کی زندگی میں دوسرے خلیفہ کے لئے بیعت نہیں کر سکتا۔ ہشام کے حکم سے سعید بن المسیب کو کوڑے مارے گئے اور سخت سزائیں دی گئیں۔ چند دن کے بعد ہشام نے ابو بکر بن عبد الرحمٰن کو ان سے بات کرنے کے لئے بھیجا۔ واپسی کے بعد ہشام نے پوچھا: کیا سعید مار کے بعد کچھ نرم پڑے۔ ابو بکر بن عبد الرحمٰن نے جواب دیا: تمہارے اس سلوک کے بعد خدا کی قسم وہ پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اپنا ہاتھ روک لو۔

خلیفہ عبد الملک کو معلوم ہوا تو اب اس نے دوسری تدبیر سوچی۔ سعید بن المسیب کی ایک لڑکی تھی جو صورت اور سیرت دونوں میں ممتاز تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے وقت کے مطابق، اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ عبد الملک نے سوچا کہ ولی عہد سے اس لڑکی کا نکاح کر دیا جائے۔ اس کے بعد لڑکی کے باپ سعید بن المسیب اپنے آپ نرم پڑ جائیں گے۔ خلیفہ نے امیر مدینہ ہشام بن اسماعیل المخزومی کے ذمہ یہ کام سپرد کیا کہ وہ سعید بن المسیب کو اس رشتہ کے لئے راضی کرے۔

ہشام نے خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں سعید بن المسیب سے ملاقات کی۔ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، اس کے بعد کہا: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، عبد الملک بن مروان نے اپنے بیٹے ولید کی آئندہ خلافت کے لئے لوگوں سے بیعت لینے کا ارادہ کیا ہے۔ بیعت لینے سے پہلے، امیر المومنین یہ چاہتے ہیں کہ آپ ولید کو اپنی دامادی میں لے لیں۔ یہ سنتے ہی سعید بن المسیب کے چہرہ پر غصہ کے آثار ظاہر ہو گئے۔ انھوں

نے کہا : مجھے ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی منظور نہیں۔

اس انکار کے بعد سعید بن المسیب کو دوبارہ مختلف قسم کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ ان پر طرح طرح سے دباؤ ڈالے گئے۔ مگر وہ برابر اپنے انکار پر قائم رہے۔ اسی کے ساتھ وہ خاموشی سے یہ سوچتے رہے کہ کوئی مناسب رشتہ سامنے آئے تو لڑکی کا عقد کر دیا جائے۔ آخر کار انھوں نے قریش کے ایک غیر معروف طالب علم ابو وداعہ کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا۔ مورخ ابن خلکان (۶۸۱ - ۶۰۸ ھ) نے ابو وداعہ کے الفاظ میں یہ واقعہ مکمل طور پر نقل کیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔ ابو وداعہ کہتے ہیں :

میں سعید بن المسیب کے حلقۂ درس میں نہایت پابندی سے بیٹھا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ مدت تک حاضر نہ ہوسکا۔ اس کے بعد جب گیا تو انھوں نے پوچھا ، اتنے دنوں تم کہاں تھے۔ میں نے جواب دیا کہ میری بیوی کا انتقال ہوگیا تھا، اس وجہ سے حاضر نہ ہوسکا۔ انھوں نے کہا ، پھر ہمیں تم نے کیوں نہ خبر کی۔ ہم بھی اس کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوتے۔

اس کے بعد جب میں اٹھنے لگا تو انھوں نے کہا ، تم نے دوسری بیوی کا کوئی انتظام کیا۔ میں نے کہا خدا آپ پر رحم فرمائے۔ کون میرے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح کرے گا جب کہ میں چند درہم سے زیادہ کی حیثیت کا آدمی نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا ، اگر میں کروں تو تم کرنے کے لئے تیار رہو۔ میں نے کہا بہت خوب۔ اس سے بہتر کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ کی حمد بیان کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا اور اسی وقت دو یا تین درہم پر میرے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح پڑھا دیا۔

ابو وداعہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں وہاں سے اٹھا اور میری خوشی کا یہ عالم تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں اپنے مکان پر پہنچا اور اس فکر میں پڑ گیا کہ اب رخصتی وغیرہ کے لئے قرض کہاں سے حاصل کروں۔ میں نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس دن میں روزہ سے تھا۔ نماز کے بعد میں نے چاہا کہ کھانا کھاؤں جو کہ روٹی تھا اور زیتون کا تیل۔ اتنے میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ آواز آئی "سعید" میں نے سعید بن مسیب کو چھوڑ کر اس نام کے ہر شخص کا تصور کیا۔ کیوں کہ سعید بن مسیب تو چالیس برس سے اپنے گھر اور مسجد کے علاوہ کہیں دیکھے نہیں گئے تھے۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہاں سعید بن مسیب کھڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر معاً خیال ہوا کہ شاید ان کا خیال بدل گیا ہے اور وہ فسخ نکاح کرانے آئے ہیں۔

میں نے کہا " اے ابو محمد ، آپ نے کیوں زحمت فرمائی۔ مجھے بلا بھیجا ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، اس وقت مجھ کو ہی تمہارے پاس آنے کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا پھر کیا حکم ہے؟ انھوں نے کہا ، مجھے خیال آیا کہ تم اپنے گھر میں تنہا ہوگے ، حالاں کہ اب تو تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ مجھے گوارا نہیں ہوا کہ تم تنہا رات بسر کرو ، اور یہ ہے تمہاری بیوی "۔ اس وقت ابن مسیب کی صاحبزادی ٹھیک ان کے پیچھے کھڑی تھیں۔ انھوں نے صاحبزادی کو دروازہ کے اندر کر کے باہر سے خود ہی دروازہ بند کر دیا اور واپس چلے گئے۔

میری بیوی شرم کے مارے گر پڑی ، پھر میں نے اندر سے دروازہ بند کیا اور اس کے بعد چھت پر چڑھ کر پڑوسیوں کو آواز دی۔ وہ لوگ جمع ہوئے اور پوچھا قصہ کیا ہے۔ میں نے کہا ، سعید بن مسیب نے آج اپنی لڑکی کا عقد میرے ساتھ کر دیا۔ اور آج ہی اچانک وہ اسے میرے گھر بھی پہنچا گئے۔ اور وہ یہاں گھر میں موجود ہے۔ لوگوں نے آکر اسے دیکھا اور میری ماں کو خبر ہوئی تو وہ بھی آگئیں اور انھوں نے کہا، اس کو چھونا تمہارے لئے حرام ہے جب تک میں حسب دستور تین دن تک اسے بنا سنوار نہ لوں۔ چنانچہ میں تین دن تک رکا رہا۔ اس کے بعد اس کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک حسین و جمیل خاتون ہے۔ کتاب اللہ کی حافظ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عالم ہے۔ اور حقوق شوہری کو خوب پہچاننے والی ہے۔

ابو وداعہ بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد ایک ماہ تک میں گھر ہی پر رہا۔ اس دوران میں سعید بن مسیب کا نہ کوئی حال ملا اور نہ ان سے ملاقات ہوئی۔ پھر ایک مہینہ کے بعد میں ان کی صحبت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہاں مجلس قائم تھی۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد کوئی بات چیت نہ کی۔ یہاں تک کہ جو لوگ مسجد میں تھے سب چلے گئے۔ اس کے بعد جب میرے سوا کوئی وہاں نہیں رہ گیا تو انھوں نے پوچھا۔ تمہارے ساتھی کا کیا حال ہے۔ میں نے کہا ، بہترین حال ہے۔ انھوں نے فرمایا: ان رابك شئ فالعصا۔ یعنی وہ کوئی ناپسندیدہ حرکت کرے تو اس کو مارو۔

پھر میں اپنے گھر لوٹ آیا۔ اور یہ سعید بن مسیب کی لڑکی وہ تھی جس کے لئے خلیفہ عبد الملک بن مروان نے اپنے لڑکے ولید کا پیغام دیا تھا جب اس نے اس کو ولی عہد بنایا تھا، تو سعید بن مسیب نے شہزادہ ولید سے رشتہ کرنے سے انکار کیا۔ جس کی وجہ سے عبد الملک سعید بن مسیب کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ سخت سردی کے دن میں انھیں کوڑے سے پیٹا گیا اور اوپر سے ٹھنڈا پانی ڈالا گیا۔

مسلم جج

قاضی شریک بن عبید اللہ بن الحارث النخعی مشہور عالم اور فقیہ ہیں۔ وہ بخاری میں ۹۵ ھ (۸۱۳ء) میں پیدا ہوئے۔ کوفہ میں ۱۷۷ھ (۸۹۴ء) میں ان کی وفات ہوئی۔ خلافت عباسی کے زمانہ میں ۱۵۳ھ میں وہ کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے۔

قاضی شریک کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک عورت ان کے پاس یہ شکایت لے کر آئی کہ کوفہ کے حاکم موسیٰ بن عیسیٰ (خلیفہ مہدی کے چچا) کے ہاتھ جب وہ اپنا باغ فروخت کرنے پر راضی نہیں ہوئی تو انھوں نے اپنے غلاموں کو حکم دیا اور انھوں نے باغ کے حدود اور نشانات مٹا دیے اور اس کو امیر موسیٰ کے باغ میں ملا دیا۔

قاضی شریک نے امیر موسی کے یہاں کہلوایا کہ وہ عدالت میں عورت کے ساتھ حاضر ہوں۔ امیر نے کوفہ کے پولیس افسر کو قاضی کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان سے گزارش کریں کہ وہ اس معاملہ میں دخل دینے سے باز رہیں۔ قاضی نے پولیس افسر کو پکڑ کر قید کر دیا۔ جب امیر موسی کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے بعض درمیانی افراد کو بھیجا۔ انھوں نے قاضی کو ان کے اس فعل پر ملامت کی۔

قاضی شریک نے ان لوگوں سے کہا کہ امیر نے کیوں اپنے آپ کو عدالت کی حاضری سے بالاتر سمجھا۔ کیا عدالت صرف عوام کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے ہے۔ عدالت بلاشبہ بڑے اور چھوٹے کے درمیان فرق نہیں کرے گی۔ اور تم نے عدالت کے معاملہ میں مداخلت کی ہے۔ ضروری ہے کہ تم کو اس کی سزا دی جائے۔ پھر قاضی نے ان لوگوں کو قید کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد امیر موسی اپنے محافظ سواروں کے ساتھ قید خانہ گئے اور قیدیوں کو بزور اس سے نکال دیا۔

اس کے بعد قاضی شریک سفر کر کے بغداد گئے۔ تاکہ خلیفہ مہدی سے ملیں اور اس سے یہ کہیں کہ وہ ان کو قضاء کے عہدہ سے الگ کر دے۔ انھوں نے خلیفہ سے کہا: خدا کی قسم، میں نے بنو عباس سے قاضی کا عہدہ نہیں مانگا تھا، خود انھیں نے مجھ کو یہ عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا، اور انھوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم بااختیار اور آزاد ہوں گے۔ اگر ہم کو قاضی بنایا گیا تو ہم اپنے فیصلے پوری طرح عدل کے مطابق کریں گے۔ مگر اب قاضی کے عہدہ پر باقی رہنے کی کوئی صورت

نہیں ہے جب کہ ہم دیانت دارانہ فیصلہ کرنے میں بے بس ہیں۔
پھر امیر موسیٰ نے قاضی سے ملاقات کی اور ان سے مہربانی کی درخواست کی۔ قاضی شریک نے کہا کہ میرے نزدیک اس کا حل صرف یہ ہے کہ وہ تمام لوگ دوبارہ قید خانہ میں لوٹائے جائیں جن کو قید کیے جانے کا میں نے حکم دیا تھا۔ چنانچہ امیر موسیٰ نے مجبور ہو کر تمام لوگوں کو دوبارہ قید خانہ میں واپس کیا۔ اور خود عورت کے ساتھ عدالت میں حاضر ہوئے۔ پھر قاضی شریک نے یہ فیصلہ دیا کہ امیر عورت کے باغ کو اسے لوٹائے اور جو حدود اور نشانات ڈھادیے گئے تھے ان کو دوبارہ قائم کرے۔ چنانچہ اس حکم کا نفاذ کیا گیا:

روی ان القاضی (شریک بن عبید الله) قد شکت الیه امرأة من انها عندما امتنعت عن بیع بستانها للامیر موسی بن عیسی عم امیر المومنین المهدی امر غلمانه فأزالوا حدود بستانها ومعالمه — وخلطوه ببستانه، فارسل یستدعی الامیر للحضور فی مجلس القضاء مع المرأة۔ فارسل الامیر رئیس الشرطة بالکوفة لیطلب منه العدول عن هذا فحبس رئیس الشرطة، ولما علم الامیر بذلك بعث بعض الوسطاء یعتبون علی القاضی فقال لهم (شریك) لماذا ترفع الامیر عن الحضور الی مجلس الحکم؟ هل نصب القضاء للفصل بین العامة فحسب، ان العدالة لا تفرق بین امیر و صغیر، وانتم بتداخلکم فی امر القضاء لا بد ان یحل بکم جزاء، ثم امر بحبسهم۔ فذهب الامیر فی رکب من حراسه الی السجن واخرج المسجونین عنوة فاعد القاضی نفسه للسفر الی بغداد للقاء الخلیفة المهدی لیطلب اعفاءه من القضاء قائلاً: (والله ماطلبت من بنی العباس ولایة القضاء، وانما هم الذین اکرهونا علیها۔ ولقد وعدونا ان نکون اعزة احرارا نتوخی العدل فی احکامنا ان تولینا القضاء۔ اما الآن فلا سبیل الی البقاء فی مجلس الحکم مادمنا عاجزین عن اداء الامانة) فلحق به الامیر واخذ یستعطفه فقال: الحل عندی ان یرد الی السجن جمیع من امرت بسجنهم فاضطر الامیر الی اعادتهم الی السجن والی حضور مجلس القضاء مع المرأة، وحکم علیه شریك برد البستان، واقامة الحدود والمعالم التی هدمت فنفذ الحکم۔

بارش شروع ہوگئی

چوتھی صدی ہجری کا واقعہ ہے ۔ اندلس میں سلطان عبد الرحمٰن الناصر کی حکومت تھی ۔ اس کا دار السلطنت قرطبہ تھا۔ قاضی منذر بن سعید اس وقت قرطبہ کے قاضی تھے اور اسی کے ساتھ وہ قرطبہ کی جامع مسجد میں نماز کی امامت کی خدمت بھی انجام دے رہے تھے۔ وہ بہت اچھے خطیب تھے اور اسی کے ساتھ بہت بڑے عالم بھی ۔

سلطان عبد الرحمٰن الناصر کو عمارتوں کا بہت شوق تھا ۔ اس نے الزہرار کے نام سے ایک شاہی بستی بسائی اور اس میں شاندار محل تعمیر کئے ۔ ان تعمیرات کے آخری دنوں میں سلطان اتنا مشغول رہا کہ مسلسل تین جمعہ میں وہ مسجد نہ پہنچ سکا ۔ چوتھے جمعہ کو جب وہ جامع مسجد آیا تو اس کی موجودگی میں قاضی منذر نے جو خطبہ دیا اس میں نام لئے بغیر سلطان پر سخت تنقید کی ۔ قاضی منذر نے ایسی آیتیں پڑھیں جن میں دنیا میں عمارتیں کھڑی کرنے اور آخرت سے غافل ہو جانے پر وعیدیں تھیں ۔ مثلاً: کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے ہو اور شاندار محل بناتے ہو گویا کہ تم کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے ۔ اور جب تم کسی پر حملہ کرتے ہو تو جبارانہ حملہ کرتے ہو ۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو (شعرار) تمھارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اس کو لے کر جہنم کی آگ میں جا گری ۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا ۔ یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے ، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی یہاں تک کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں ۔ اور اللہ علیم وحکیم ہے (توبہ) اسی طرح قاضی منذر نے اس مضمون کی بہت سی حدیثیں سنائیں اور ان کی تشریح کی ۔ اپنے خطبہ میں اگرچہ انھوں نے سلطان کا نام نہیں لیا مگر مسجد کا ہر نمازی سمجھ رہا تھا کہ ان سخت تنقیدوں کا مخاطب کون ہے اور وہ کس کے اوپر پڑ رہی ہیں ۔

تنقید یوں بھی آدمی کے اوپر بہت سخت ہوتی ہے اور جب مجمع عام میں کسی پر تنقید کی جائے تو وہ اور بھی زیادہ ناگواری کا باعث ہوتی ہے ۔ مزید یہ کہ یہ تنقید ایک ماتحت کی زبان سے اپنے حاکم کے اوپر تھی ۔ اور جب کوئی حاکم اپنے ماتحت کو تنقید کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس پر کبر کا سخت دورہ پڑتا ہے ۔ بڑے بڑے شریف اور دیندار لوگ بھی اس وقت قابو سے باہر ہو جاتے ہیں ۔ مگر سلطان نے حد درجہ ضبط سے کام لیا ۔ اگرچہ

سلطان پر اس تنقید کا بہت زیادہ اثر تھا مگر وہ مسجد میں کچھ نہ بولا اور نماز کے بعد خاموشی سے اٹھ کر باہر آگیا۔

گھر پہنچ کر سلطان نے اپنے لڑکے الحکم سے کہا کہ آج قاضی منذر نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ ان کے پیچھے جمعہ کی نماز کبھی نہیں پڑھوں گا۔ الحکم نے کہا: قاضی منذر کا امام ہونا یا نہ ہونا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ ان کو معزول کر دیجئے اور ان کی جگہ دوسرا کوئی امام مقرر کر دیجئے جو ایسی گستاخی نہ کرے۔ یہ سن کر سلطان غصہ میں آگیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا: تمھارا برا ہو، ایک شخص جو ہدایت سے دور ہے اور راستہ سے بھٹکا ہوا ہے کیا اس کی خوشی کی خاطر قاضی منذر جیسے خوبیوں والے آدمی کو معزول کر دیا جائے گا۔ یہ بات کبھی نہیں ہوسکتی (ھذا مالا یکون) مجھے ان کی باتوں سے چوٹ لگی اس لئے میں نے ان کے پیچھے جمعہ نہ پڑھنے کی قسم کھالی۔ میری خواہش ہے کہ اس قسم کے کفارہ کی کوئی صورت نکل آئے۔ تاہم قاضی منذر ہماری زندگی میں اور اپنی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں گے (بل یصلی بالناس حیاتنا وحیاته انشاء اللہ تعالیٰ) چنانچہ قاضی منذر بدستور جمعہ کی نماز پڑھاتے رہے۔
عبدالرحمٰن الناصر کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے نے بھی ان کے مقام کو اسی طرح باقی رکھا۔

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کے زمانہ میں ایک بار قحط پڑا۔ بہت سخت حالات پیدا ہو گئے۔ سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر بن سعید کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ آپ استسقار کی نماز پڑھائیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برسائے۔ قاضی منذر نے سلطان کے قاصد سے پوچھا کہ سلطان نے میرے پاس دعا کا پیغام بھیجا ہے مگر وہ خود کیا کر رہے ہیں۔ قاصد نے کہا: آج سے زیادہ ہم نے کبھی ان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں پایا۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہیں۔ تنہائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ مٹی کے فرش پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے اور اللہ سے کہہ رہے تھے: خدایا میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا حالاں کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (ھذہ ناصیتی بیدك، اتراك تعذب بی الرعیة وانت ارحم الراحمین)

یہ سن کر قاضی منذر کے چہرے پر اطمینان ظاہر ہوگیا۔ انھوں نے قاصد سے کہا: اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ۔ اب ضرور بارش ہوگی۔ کیوں کہ زمین کا حاکم جب تضرع کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے (اذا خشع جبار الارض فقد رحم جبار السماء) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قاصد واپس ہو کر گھر پہنچا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔

امکان ختم نہیں ہوتا

عبدالرحمٰن بن معاویہ ابن ہشام (۱۷۲-۱۱۳ھ) بنو امیہ کا ایک شہزادہ تھا۔ وہ نہایت ذہین اور باصلاحیت تھا۔ چنانچہ اس کی تربیت ابتدا ہی سے نہایت شاہانہ انداز میں کی گئی۔ اس کو اس طرح تیار کیا گیا کہ جب وہ بڑا ہو تو کامیابی کے ساتھ تخت خلافت پر بیٹھ سکے۔

مگر ۱۳۲ھ میں بنو امیہ کی خلافت ختم ہو کر بنو عباس کی خلافت شروع ہو گئی۔ اس وقت عبدالرحمٰن کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ جب عباسی لشکر شام میں داخل ہو کر دمشق پر قابض ہو گیا اور بنو امیہ کا قتل عام ہونے لگا اس وقت اتفاق سے عبدالرحمٰن دمشق میں موجود نہ تھا۔ بلکہ باہر دریائے فرات کے کنارے ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ یہاں دریا کے کنارے اس کی جاگیر تھی اور اس کے باغات وغیرہ تھے۔ اس وقت وہ یہیں پر مقیم تھا۔

عبدالرحمٰن کو جب معلوم ہوا کہ بنو امیہ کے افراد کا قتل عام ہو رہا ہے تو وہ یہاں درختوں کے جھنڈ میں خیمہ لگا کر چھپ گیا۔ ایک روز وہ اپنے خیمہ میں تھا کہ اس کا چار سال کا لڑکا خوف زدہ حالت میں خیمہ میں آیا۔ معلوم ہوا کہ بنو عباس کے سپاہی اس کو تلاش کرتے ہوئے اس باغ تک پہونچ گیے ہیں۔ عبدالرحمٰن نے اپنے بچہ کو گود میں اٹھایا اور دریا کی طرف بھاگا۔ وہ دریا میں کود پڑا اور تیرتا ہوا اس کے دوسرے کنارے پر پہونچ گیا۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ دمشق سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم کئی سال تک اس کی زندگی نہایت مصیبت کی زندگی رہی۔ دشمن سے بچنے کے لیے دریا میں کودنا، جنگلوں میں پناہ لینا، بھوکے پیاسے ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف بھاگنا، یہ اس کی زندگی تھی۔ اسی حال میں وہ سبطہ پہونچا جو افریقہ کے ساحل پر واقع تھا۔

بظاہر عبدالرحمٰن کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی بنتے بنتے بگڑ گئی تھی۔ بچپن کی عمر میں جس کا یہ حال تھا کہ تخت خلافت اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جوانی کی عمر کو پہونچ کر اس کے لیے زمین میں ایک گوشہ بھی نہیں رہا جہاں وہ سکون کی زندگی گزار سکے۔

مگر مایوسی کی آخری حد پر پہونچ کر اس کے لیے امید کی روشنی پیدا ہوگئی۔ عین اسی زمانہ میں اندلس کے مسلمان بے سردار ہو کر آپس میں لڑ رہے تھے۔ دمشق کے مرکز خلافت سے دور ہونے کی وجہ سے یہ حال تھا کہ دمشق اور قرطبہ کے درمیان ایک پیغام کے آنے جانے میں اکثر مہینوں لگ جاتے تھے۔ اس بنا پر اندلس کے اوپر دمشق کی مضبوط گرفت باقی نہیں رہی تھی۔

اندلس کے یہ حالات عبدالرحمٰن بن معاویہ کے لیے ایڈوانٹیج بن گیے۔ وہ آبنائے جبرالٹر کو پار کر کے اندلس پہونچا۔ وہاں کے مسلمانوں کو ایک سردار کی ضرورت تھی۔ عبدالرحمٰن اپنی شخصی قابلیت نیز بنوامیہ کا ولی عہد ہونے کی وجہ سے بہت جلد وہاں کے لوگوں کا مرجع بن گیا اور بالآخر اس نے اندلس میں مضبوط مسلم سلطنت قائم کی۔ یہی امیر عبدالرحمٰن اندلس کی علمی اور تہذیبی ترقیوں کا بانی ہے۔ وہ شخص جس کی تاریخ دمشق میں ختم ہو چکی تھی اس نے اپنی حوصلہ مندی کی بنا پر قرطبہ میں اپنی ایک نئی شاندار تر تاریخ بنالی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی کسی کے لیے امکان ختم نہیں ہوتا۔ جہاں ایک موقع ختم ہو وہیں دوسرا زیادہ بہتر موقع اس کے لیے موجود رہتا ہے۔ جب ایک تاریخ اختتام پر پہونچتی ہے تو وہیں دوسری تاریخ کے آغاز کے امکانات شروع ہو جاتے ہیں۔

مگر نئے امکانات کبھی اپنے آپ واقعہ نہیں بنتے۔ ان کو استعمال کر کے انھیں واقعہ بنانے کے لیے ایک حوصلہ مند انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آدمی اپنی ہمت نہ کھوئے، اگر وہ نئی جدوجہد کی ضروری شرطیں پوری کرنے کے لیے تیار ہو تو اس کے لیے ناکامی کا سوال نہیں۔ یہ دنیا خدا نے اسی لیے بنائی ہے کہ آدمی یہاں جدوجہد کر کے کامیاب ہو۔ اب جو شخص ناکام ہوتا ہے وہ اپنی نادانیوں سے ناکام ہوتا ہے، وہ خود اپنی کوتاہیوں کی سزا بھگتتا ہے۔

"انسان کے لیے کبھی امکان ختم نہیں ہوتا" یہ جملہ اتنا ہی با معنیٰ ہے جتنا یہ کہنا کہ "اس دنیا میں کبھی صبح کا آنا بند نہیں ہوتا"۔ جس طرح ہر رات کے بعد صبح کا آنا یقینی ہے اسی طرح ہر ناکامی کے بعد دوبارہ کامیابی کا دور آنا یقینی ہے۔ تاہم رات کے بعد نئی صبح لانے کے لیے زمین و آسمان کو عظیم گردش کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح کسی آدمی کی زندگی میں ناکامی کے بعد کامیابی اس وقت آتی ہے جب کہ وہ اس کی خاطر عظیم جدوجہد کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اسلامی حکمراں

صلاح الدین ایوبی (۱۱۹۳ - ۱۱۳۸) مصری سلطان کی فوج میں معمولی سپاہی تھے ۔ اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے وہ ۳۱ سال کی عمر میں مصری افواج کے سپہ سالار مقرر کیے گئے ۔ اسی کے ساتھ انھیں مصر کا وزیر بھی بنا دیا گیا اور انھیں مَلِک کا خطاب دیا گیا۔ بعد کو ایک انقلاب کے نتیجہ میں وہ مصر کے خود مختار سلطان ہو گیے ۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ طویل صلیبی جنگوں کے درمیان یورپ کی مسیحی طاقتوں نے یروشلم (فلسطین) پر قبضہ کر لیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے مسلم حکمرانوں میں یہ تبلیغ کی کہ وہ اپنی متحدہ کوشش ہی سے مسیحی یلغار کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ مصر، شام وغیرہ ممالک کو متحد کرنے میں کامیاب ہو گیے ۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے پوری قوم میں جہادی روح پیدا کر دی۔ انھوں نے زبردست تیاری کے بعد جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین (فلسطین) کے مقام پر مسیحی افواج پر حملہ کیا اور ان کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس کے بعد سلطان صلاح الدین کی فوجوں نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ یروشلم تک پہونچ گئیں اور بالآخر یروشلم کو فتح کر کے فلسطین کو دوبارہ اسلامی خلافت کا حصہ بنا دیا۔

تاہم سلطان صلاح الدین کی فوجی کارروائی نمایاں طور پر مسیحی اقوام کی کارروائیوں سے مختلف تھی۔ مسیحی اقوام نے فلسطین پر قبضہ کرنے کے بعد نہایت وحشیانہ انداز میں مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ اس کے برعکس سلطان صلاح الدین ایوبی نے مکمل ضبط سے کام لیا۔ انھوں نے کسی قسم کی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اس سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے :

> Saladin's crowning achievement and the most disastrous blow to the whole crusading movement came on October 2, 1187, when Jerusalem, holy to both Muslim and Christian alike, surrendered to the Sultan's army after 88 years in the hands of the Franks. In stark contrast to the city's conquest by the Christians, when blood flowed freely during the barbaric slaughter of its inhabitants, the Muslim reconquest was marked by the civilized good faith and courteous behaviour of Saladin and his troops.
>
> *Encyclopaedia Britannica*, 1984 Volume 16, p. 177

صلاح الدین کی شاندار کامیابی اور پوری صلیبی تحریک کی سب سے زیادہ تباہ کن شکست ۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو ظہور میں آئی جب کہ یروشلم، جو کہ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک مقدس ہے، وہ ۸۸ برس تک مسیحیوں کے قبضہ میں رہنے کے بعد دوبارہ سلطان کی فوجوں کے قبضہ میں آگیا۔ مسیحیوں نے جب شہر پر قبضہ کیا تھا تو انھوں نے وحشیانہ طور پر اس کے باشندوں کو قتل کیا اور آزادانہ طور پر لوگوں کا خون بہایا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ مہذب انسانوں کا قبضہ تھا، صلاح الدین اور اس کی فوجوں نے مفتوح کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کیا۔

رعایا کے ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی کا یہ انصاف محض اتفاقی نہ تھا۔ یہ اس کی اسلامیت کا نتیجہ تھا۔ صلاح الدین صرف ایک بہادر اور حوصلہ مند شہسوار ہی نہ تھا۔ وہ ایک خدا ترس اور عبادت گذار آدمی تھا۔ اس کا ذہن اسلامی تعلیمات کے تحت بنا تھا۔

اسلامی تعلیمات کے اثر سے سلطان صلاح الدین کا یہ حال تھا کہ وہ دنیا سے زیادہ آخرت کو اہمیت دیتا تھا۔ وہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ قیامت میں اس سے اس کی رعایا کے بارہ میں پوچھ ہوگی۔ اسلام اس کے لیے اس میں مانع بن گیا تھا کہ اس کے اندر گھمنڈ کا مزاج پیدا ہو۔ اس کے برعکس اس کے اندر زہد اور تواضع کا مزاج تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے سلطان صلاح الدین کے زہد وتقویٰ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> --- and on March 4, 1193, he died. While his relatives were already scrambling for pieces of the empire, his friends found that the most powerful and most generous ruler in the Muslim world had not left enough money to pay for his grave. (16/178)

اور ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو صلاح الدین کا انتقال ہوگیا۔ جب کہ اس کے رشتہ دار ابھی سلطنت کے ٹکڑوں کے لیے آپس میں کش مکش کر رہے تھے، اس کے دوستوں نے پایا کہ مسلم دنیا کے سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ فیاض حکمراں نے اپنے پیچھے اتنی رقم بھی نہیں چھوڑی ہے جو اس کی قبر کے اخراجات کو پورا کر سکے۔

اسلام ایک طرف انسان کی صلاحیتوں کو ترقی دیتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کو اس سے روکتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کے استعمال میں حد سے تجاوز کرنے لگے۔

اختلاف کے باوجود

اموی خاندان کے ایک نوجوان عبد الرحمٰن نے ۷۵۶ء میں اسپین میں بنو امیہ کی سلطنت کی بنیاد رکھی، اس کا دار السلطنت قرطبہ تھا۔ اسی خاندان میں ایک سلطان الحکم گزرا ہے۔ اس نے ۹۶۱ء سے لے کر ۹۷۶ء تک اسپین میں حکومت کی۔

الحکم کو مسلم اسپین کا سب سے بڑا حکمراں کہا جاتا ہے۔ مورخ ابن اثیر نے اس کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں : كان محبا لاهل العلم، عالمًا، فقيها في المذاهب، عالمًا بالانساب والتواريخ، جماعا للكتب والعلماء (وہ اہل علم کو دوست رکھتا تھا۔ عالم اور فقیہہ تھا۔ انساب اور تاریخ کا ماہر تھا۔ کتابوں اور علماء کو اپنے پاس جمع رکھتا تھا) الکامل فی التاریخ ۸/ ۶۷۷

الحکم کی علم پسندی نے اس کو اہل علم کا بے حد قدرداں بنا دیا تھا۔ وہ اہل علم کو نہایت عزت اور احترام کا درجہ دیتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک عالم اگر اس کی ذات پر تنقید کرے یا اس کی مرضی کا لحاظ نہ کرے تب بھی اس کی قدر دانی میں کمی نہیں آتی تھی۔ اپنے تمام ترجاہ وجلال کے باوجود وہ اہل علم کے آگے جھک جاتا تھا۔ اس کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے :

الحکم کے زمانہ میں ایک عالم تھے جن کا نام ابو ابراہیم تھا۔ ایک روز وہ قرطبہ کی مسجد ابو عثمان میں وعظ بیان کر رہے تھے۔ عین اس وقت سلطان کا ایک قاصد مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے کہا کہ اے ابو ابراہیم، امیر المومنین باہر آپ کے انتظار میں ہیں۔ اور آپ کو اسی وقت بلا رہے ہیں۔ ابو ابراہیم نے بے پروائی کے ساتھ اس شخص کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ تم جا کر امیر المومنین سے کہہ دو کہ ابو ابراہیم اس وقت اللہ کے کام میں مصروف ہے۔ وہ جب تک اس کام سے فارغ نہ ہو جائے، آپ کے پاس نہیں آسکتا۔

الحکم کے قاصد کو یہ جواب سن کر حیرانی ہوئی۔ وہ سلطان کی طرف واپس گیا اور ڈرتے ڈرتے اس کو ابو ابراہیم کا جواب سنایا۔ قاصد کی توقع کے خلاف، الحکم نے اس کا کوئی برا اثر نہیں لیا۔ اور کسی خفگی کے بغیر کہا کہ تم جا کر ابو ابراہیم سے میرا یہ پیغام کہہ دو کہ ان کی اس

بات کو سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے کہ وہ اللہ کے کام میں مصروف ہیں۔ جب ان کو اس کام سے فراغت ہو جائے تو اس وقت وہ میرے پاس آ جائیں۔ میں دربار میں ان کا انتظار کروں گا۔

شاہی قاصد نے دوبارہ مسجد میں آکر ابو ابراہیم کو الحکم کا پیغام سنایا۔ ابو ابراہیم نے کہا کہ تم جا کر امیر المومنین سے کہہ دو کہ میں بڑھاپے کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ پیدل چل کر ان کے پاس آؤں یا گھوڑے کی سواری کروں۔ باب السدّہ جو کھلا ہوا ہے وہ یہاں سے کافی دور ہے۔ باب الصنع قریب ہے مگر وہ بند رہتا ہے۔ اگر امیر المومنین باب الصنع کھولنے کی اجازت دے دیں تو میں اس دروازہ سے ان کے پاس آ جاؤں گا۔

باب الصنع ایک مخصوص دروازہ تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا۔ کسی ہنگامی موقع پر ہی اس کو کھولنے کی اجازت ہوتی تھی۔ ابو ابراہیم مذکورہ پیغام دے کر اپنے وعظ میں مصروف ہو گئے۔ دوسری طرف مذکورہ قاصد الحکم کے پاس گیا اور اس کو ابو ابراہیم کا پیغام پہنچایا۔ الحکم نے قاصد سے کہا کہ تم جا کر مسجد میں بیٹھ جاؤ اور جب وہ اپنا وعظ ختم کر لیں تو ان کو باب الصنع کے راستہ سے گزار کر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ قاصد واپس آکر مسجد میں بیٹھا رہا۔ ابو ابراہیم نے جب اپنا وعظ ختم کیا تو اس نے ان سے کہا کہ باب الصنع آپ کے لیے کھول دیا گیا ہے اور امیر المومنین آپ کے منتظر ہیں۔ اس کے بعد ابو ابراہیم مسجد سے نکلے اور چلتے ہوئے باب الصنع پر پہنچے۔ وہاں امراء اور درباریوں کی بڑی تعداد ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ ابو ابراہیم دربار کے اندر داخل ہوئے۔ الحکم نے کچھ دیر تک ان سے باتیں کیں۔ اس کے بعد وہ اسی باب الصنع سے عزت و احترام کے ساتھ واپس ہو گئے۔

دورِ اول میں جو اسلامی انقلاب آیا۔ اس کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس نے لوگوں میں اکابر پرستی کے بجائے خدا پرستی پیدا کر دی۔ اس نے لوگوں میں یہ مزاج بنایا کہ وہ چیزوں کو شخصیتوں کی نسبت سے دیکھنے کے بجائے حقیقتوں کی نسبت سے دیکھیں۔ یہ فکری انقلاب اتنا طاقت ور تھا کہ بعد کو جب مسلمانوں میں خلفاء کے بجائے سلاطین ہونے لگے اس وقت بھی لوگ ملوک اور سلاطین پر کھلی تنقیدیں کرتے تھے اور کسی کو بھی اس پر ٹوکنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

پکار کے وقت

تھیوفیلس (Theophilus) بازنطینی سلطنت کے آخری دور کا حکمراں ہے۔ اس کا مرکز سلطنت قسطنطنیہ تھا۔ اس کا زمانہ حکومت ۸۲۹ء تا ۸۴۲ء ہے۔ تھیوفیلس عباسی خلیفہ المعتصم کا ہم عصر تھا۔

دور اوّل کے مسلمانوں نے قدیم رومی (بازنطینی) سلطنت کے بڑے حصہ کو پہلی صدی ہجری میں فتح کرلیا تھا۔ تاہم قسطنطنیہ اب بھی بازنطینی حکمراں کے قبضہ میں تھا۔ موجودہ ترکی کے ایک حصّہ پر اب بھی اس کی حکومت قائم تھی۔

قسطنطنیہ کا بازنطینی بادشاہ تھیوفیلس ۲۲۳ھ (۸۳۸ء) میں ایک بڑا لشکر لے کر نکلا اور مسلم علاقہ میں پہونچ کر زبطرہ پر چھاپہ مارا۔ اسی کے ساتھ اس نے ملطیہ کے مسلم قلعہ پر حملہ کیا۔ ان حملوں میں اس نے بہت سے مسلمان مردوں اور عورتوں کو قتل کیا۔ انھیں گرفتار کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ لوگوں کا مُثلہ کیا۔

اس موقع پر ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ بازنطینی سپاہیوں نے ایک عربی عورت کو پکڑا اور اس کو گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ عورت چلّا اٹھی۔ اس کی زبان سے نکلا : وامعتصماہ (ہائے معتصم)

خلیفہ المعتصم اس وقت بغداد میں تھا۔ وہاں سے آنے والوں نے خلیفہ کو بازنطینی حکمراں کے مظالم کی خبریں بتائیں۔ اسی کے ساتھ مذکورہ عرب عورت کا قصّہ بھی بتایا۔ المعتصم اس کو سن کر تڑپ اٹھا۔ اس وقت وہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وامعتصماہ کا لفظ سنا تو اسی وقت لبّیك لبّیك کہتے ہوئے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنے محل کی چھت پر چڑھا اور پکار کر کہا : النفیر، النفیر (کوچ، کوچ)

اس کے بعد المعتصم نے زبردست تیاری کی اور ایک طاقت ور فوج کو لے کر مقام حادثہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ وہ عموریہ (Amorium) پہونچ گیا۔ عموریہ (ترکی) اس وقت بازنطینیوں کے قبضہ میں تھا اور یہاں ان کا قلعہ تھا۔ المعتصم نے قلعہ کو گھیر لیا اور حکم دیا کہ منجنیق کے ذریعہ اس پر گولے برسائے جائیں۔ یہاں تک کہ اس کی دیواریں ٹوٹ گئیں۔ المعتصم اپنی فوج کو لے کر قلعہ کے اندر داخل ہوگیا۔ اہل قلعہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ المعتصم نے تمام مسلم قیدیوں کو چھڑایا اور اس عرب عورت کو بھی قید سے رہا کیا جس نے اس سے پہلے وامعتصماہ کہہ کر خلیفہ کو پکارا تھا۔

مظلوم کی پکار پر دوڑنا زندہ انسان کی خاص علامت ہے۔ ایک شخص جس کے اندر انسانی جوہر موجود ہو۔ جو اپنے مردانہ اوصاف پر قائم ہو، وہ ایسی کسی پکار کو نظر انداز کرنے کا تحمل نہیں کر سکتا۔ یہی وہ انسانی صفت ہے جس کے بارہ میں عرب شاعر نے کہا ہے کہ ان کا بھائی جب اپنی کسی مصیبت پر انھیں پکارے تو اس وقت وہ تفصیل نہیں پوچھتے، وہ فوراً اس کی مدد پر دوڑ پڑتے ہیں :

لا یسئلون اخاهم حین یندبهم　　فی النائبات علیٰ ما قال برهانا

مظلوم کی مدد کرنا یا مظلوم کی پکار پر دوڑنا ایک فطری صفت ہے۔ جن لوگوں کی فطرت زندہ ہو، ان کے اندر یہ انسانی خصوصیت بھی ضرور زندہ ہوگی۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی فطرت کے اعتبار سے زندہ ہو اور اس کے اندر یہ صفت نہ پائی جائے۔

قومی تعصب یا ذاتی تعلق کے تحت ہر آدمی اپنے لوگوں کی مدد کے لیے دوڑتا ہے۔ مگر اس قسم کے دوڑنے کو کوئی اعلیٰ اخلاقی صفت نہیں کہا جا سکتا۔ اعلیٰ اخلاقی صفت کا درجہ صرف اس دوڑنے کو حاصل ہے جو ذاتی تعلق یا قومی تعصب جیسی چیزوں سے بلند ہو۔ جب کہ آدمی اس لیے دوڑ پڑے کہ پکارنے والا مظلوم ہے، نہ اس لیے کہ ذاتی مفاد یا جماعتی حمیت کا تقاضا ہے کہ اس کی پکار پر دوڑا جائے۔

مومن ایک با اصول انسان ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ مفاد کے لیے تڑپتے ہیں، مومن اصول کے لیے تڑپتا ہے۔ دوسرے لوگ اپنی ذات کے لیے عمل کرتے ہیں، مومن اپنے سوا دوسروں کے لیے عمل کرتا ہے۔ عام آدمی اس وقت حرکت میں آتا ہے جب کہ اس کی اپنی ذات کے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہو۔ جب کہ مومن کو صرف یہ بات متحرک کر دینے کے لیے کافی ہے کہ انسانی اصولوں میں سے کوئی اصول ٹوٹ گیا ہے۔

المعتصم کے جس واقعہ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس کا حوالہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (IX/939, 3/559) میں مختصر طور پر موجود ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تھیوفلس کو ایک خونی جنگ میں جولائی ۸۳۸ میں شکست ہوئی :

Theophilus was defeated in a bloody battle at Dazmana in July 838.

اسلامی شجاعت

حطین کی جنگ (۱۱۸۷) تاریخ کی مشہور جنگ ہے۔ حطین شمالی فلسطین کا ایک مقام ہے۔ صلاح الدین ایوبی نے اسی مقام پر اپنی غیر معمولی جنگی منصوبہ بندی کے ذریعہ صلیبی فوجوں پر فتح حاصل کی۔ اس وقت مسلم فوج کی تعداد ۱۸ ہزار تھی، اور عیسائی فوج کی تعداد ۱۵ ہزار۔ جنگ میں بیشتر عیسائی فوجی مارے گئے۔ اور مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔

جنگ کے بعد بہت سے عیسائی سردار گرفتار ہوئے۔ ان میں یروشلم کا بادشاہ (Guy de Lusignan) اور فرانسیسی جنرل ریجینالڈ (Reginald) بھی شامل تھا۔ ریجینالڈ کے متعلق مورخین متفق ہیں کہ اس نے صلاح الدین ایوبی کے ساتھ بار بار غدر کا معاملہ کیا تھا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے لکھا ہے کہ ریجینالڈ ۱۱۴۷ء اور ۱۱۸۷ء کے درمیان ہونے والی صلیبی لڑائیوں میں اہم فوجی شخصیتوں میں سے ایک تھا جس کی صلح کی مدت کے دوران مسلم قافلوں پر ناعاقبت اندیشانہ حملوں کی پالیسی آخر کار یروشلم کی لاتینی بادشاہت کی بربادی اور اس کے بیشتر علاقوں کے کھوئے جانے کا سبب بنی:

> One of the leading military figures of the Crusades between 1147 and 1187, whose reckless policy in raiding Muslim caravans during periods of truce led to the virtual destruction of the Latin Kingdom of Jerusalem and the loss of most of its territory (VIII/480).

مورخ ابن شداد نے لکھا ہے کہ ریجینالڈ نے ایک بار مسلم قافلہ پر دھوکے سے حملہ کیا۔ انھوں نے اس کو خدا کا واسطہ دلایا۔ اور اس معاہدہ صلح کا واسطہ دیا جو اس کے اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ مگر ریجینالڈ نے کہا کہ اپنے محمد سے کہو، وہ تمہیں بچائے۔ یہ خبر جب صلاح الدین ایوبی تک پہونچی تو اس نے نذر مانی کہ اللہ جب اس کے اوپر مجھے فتح دے گا تو میں خود اس کو قتل کروں گا (انہ لما غدر بالقافلة ناشدوا اللہ والصلح الذی بینہ وبین المسلمین۔ فقال: قولوا لمحمد کم یخلصکم۔ فلما بلغہ ذلک عنہ نذر انہ متی اظفرہ اللہ بہ قتلہ بنفسہ، صفحہ ۱۲۷)

جنگ کے بعد ریجینالڈ اور دوسرے لوگ قیدی کی صورت میں صلاح الدین ایوبی کے سامنے لائے گیے۔ صلاح الدین نے ریجینالڈ کی غداری کے واقعات اس کو یاد دلائے۔ نیز اس واقعہ کو یاد دلایا جب کہ اس نے حاجیوں کے ایک قافلہ کو لوٹا تھا۔ اور ان کی فریاد پر ان سے کہا تھا کہ اپنے محمد کو بلاؤ، وہ تم کو بچائیں گے۔ اس کے بعد صلاح الدین نے تلوار اپنے میان سے نکالی اور ریجینالڈ کی گردن مار دی۔ اس کو قتل کرتے ہوئے صلاح الدین نے کہا کہ لو یہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمہارا انتقام لیتا ہوں (ھا انا ذا انتصر لمحمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم)

یروشلم کے بادشاہ گائی نے جب ریجینالڈ کا یہ انجام دیکھا تو وہ کانپ اٹھا۔ وہ ڈرا کہ اب میرا بھی یہی انجام ہوگا۔ اس کو یقین ہوگیا کہ تلوار کا دوسرا وار اس کے اوپر پڑنے والا ہے۔ مگر سلطان صلاح الدین نے اس کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا:

لیس من عادة الملوك ان يقتلوا الملوك ولما هذا فانه نقض العهد مرة بعد مرةٍ فجرى ما جرى (النوادر السلطانیہ، ۶۴)	یہ بادشاہوں کی عادت نہیں کہ وہ بادشاہوں کو قتل کریں۔ باقی اس شخص (ریجینالڈ) نے تو عہد کو بار بار توڑا تھا۔ پس ہوا جو کچھ ہوا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس شخص کو قتل کر دیا جس نے بار بار کے غدر اور معاہدہ کی خلاف ورزی سے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ ناقابل معافی حد تک ایک برا آدمی ہے۔ مگر صلاح الدین نے اس شخص کو چھوڑ دیا جو اگرچہ دشمن تھا۔ مگر اس نے خبث اور کمینگی اور نقض عہد کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

اسی کا نام اسلامی شجاعت ہے۔ سچا اسلامی بہادر وہ ہے جو لڑنے کے ساتھ صلح بھی کرنا جانتا ہو۔ جو انتقام لینے کے ساتھ معاف کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔ جو یہ جانتا ہو کہ کب تلوار اٹھائی جاتی ہے اور کب یہ ضروری ہوتا ہے کہ تلوار کو میان میں ڈال لیا جائے۔

مومن کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حد کے اندر رہتا ہے۔ کسی سے خوش ہو تب بھی وہ ایک حد کے اندر رہ کر خوشی کا اظہار کرے گا۔ وہ اگر کسی سے غصہ ہو جائے تب بھی اس کا غصہ اس کو حد سے باہر کرنے والا ثابت نہیں ہوگا۔ مومن کی یہ صفت اس کو قابل پیشین گوئی کردار کا حامل بنا دیتی ہے۔

تاریخ کا صفحہ

اسپین میں تقریباً ۸۰۰ سال تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ ۱۴۹۲ء میں اس حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ خاتمہ کے وقت بھی مسلمان اپنے حریف اسپینیوں کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ مسیحیوں کی فتح اور مسلمانوں کی شکست کا بنیادی سبب یہ تھا کہ مسیحیوں نے متحد ہو کر اپنی طاقت بہت زیادہ بڑھالی اور مسلمانوں نے آپس کے اختلاف کی وجہ سے اپنے آپ کو بے حد کمزور کر لیا۔

مسلم دور حکومت میں بھی اسپین کا ایک نسبتاً چھوٹا حصہ مسیحیوں کے پاس تھا۔ اس کو اپنا سیاسی مرکز بنا کر وہ مسلم حکومت کے خلاف کارروائی کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر آخری دور میں اپنا رقبہ کافی بڑھالیا تھا اور مسلمانوں کے پاس صرف غرناطہ (Granada) رہ گیا تھا۔

دور آخر کا ایک مسلم حکمراں سلطان ابوالحسن تھا۔ مسیحی حکمراں فردی نند (Ferdinand II) نے سلطان سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کو خراج دینا منظور کرے۔ سلطان ابوالحسن نہایت بہادر تھا۔ اس نے فردی نند کو جواب میں لکھا کہ "غرناطہ کے دار الضرب میں اب سونے کے سکوں کے بجائے فولادی تلواریں تیار کی جارہی ہیں تاکہ مسیحیوں کی گردنیں ماری جائیں" اس کے بعد دونوں کے درمیان کئی مسلح تصادم ہوئے۔ آخر کار ۸۸۷ھ میں لوشہ کے مقام پر دونوں کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ اس میں فردی نند کی فوجوں کو مکمل شکست اور سلطان ابوالحسن کی فوجوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔

اس کے بعد فردی نند نے ازسرنو اپنے کو تیار کرنا شروع کیا۔ اس وقت مسیحی اسپین میں دو حکومتیں تھیں۔ ایک اراغون (Aragon) جہاں فردی نند کی حکومت تھی۔ دوسرا قسطلہ (Castile) جہاں ملکہ ازبیلا (Isabella I) تخت کی مالک تھی، فردی نند نے یہ دانش مندی کی کہ ازبیلا کو راضی کر کے ۱۴۶۹ء میں اس سے نکاح کر لیا۔ اس طرح دونوں کو ملا کر ایک بڑی مسیحی سلطنت وجود میں آگئی۔

ایک طرف مسیحی دنیا میں یہ اتحادی واقعہ ہوا۔ دوسری طرف یہ اختلافی واقعہ پیش آیا کہ سلطان ابوالحسن کے لڑکے ابوعبداللہ محمد نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر دی، وہ سلطنت غرناطہ کے ایک حصہ پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔ اب سلطان ابوالحسن کی حکومت صرف چار ہزار مربع میل پر مشتمل ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف فردی نند کی سلطنت کا رقبہ بڑھ کر سوا لاکھ مربع میل ہوگیا۔ اس صدمہ کے بعد

سلطان ابو الحسن پر فالج کا حملہ ہوا اور اس کی بینائی بھی ختم ہو گئی۔

سلطان ابو الحسن اس کے بعد غرناطہ کے تخت سے دستبردار ہو گیا اور اپنی جگہ اپنے بھائی ابو عبد اللہ زغل کو سلطان مقرر کیا۔ اس کے بعد ایک سازش کے تحت ابو عبد اللہ زغل کو سلطنت سے ہٹا دیا گیا اور ابو عبد اللہ محمد پوری سلطنتِ غرناطہ کا حکمراں بن گیا۔ مگر اس کے اندر اپنے باپ والی دانشمندی موجود نہ تھی۔ چند مقابلوں میں اس نے مسیحی حکمراں سے شکست کھائی۔

آخری مرحلہ میں غرناطہ کے قلعہ کو مسیحی فوجوں نے گھیر لیا۔ ابو عبد اللہ محمد جس نے اپنے اور اپنے چچا کے مقابلہ میں بہادری دکھائی تھی وہ مسیحی فوجوں کے مقابلہ میں صرف بزدل ثابت ہوا۔ آخر کار ۲ جنوری ۱۴۹۲ کو اس نے قلعہ اور غرناطہ کی دستبرداری کے معاہدہ پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدہ پر ایک طرف فاتح فردی نند نے اپنا دستخط ثبت کیا۔ اور دوسری طرف مفتوح ابو عبد اللہ محمد نے۔

ایک مورخ نے اسپین کے مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غرناطہ کے آخری مسلم حکمراں سلطان ابو الحسن نے فردی نند اور ازبیلا کو شکست دی تھی۔ مگر اس کے اپنے لڑکے ابو عبد اللہ نے اس کے خلاف بغاوت کر دی جو آخر کار اس کے باپ کے زوال کا سبب بنی۔

The last ruler of Granada, Sultan Abul-Hasan, defeated Ferdinand II (1452-1516) and Queen Isabella, but his own son, Abu Abdullah, made a coup against his father which resulted to the downfall of his father.

اس دنیا میں باہمی اتحاد سب سے بڑی طاقت ہے اور باہمی اختلاف سب سے بڑی کمزوری۔ یہ بلاشبہ تاریخ کا سب سے بڑا سبق ہے۔

اختلاف کا سبب کیا ہوتا ہے اور اتحاد کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ جب لوگوں کے اوپر ذاتی مفاد کا غلبہ ہو جائے تو ان کے درمیان اختلاف ابھر آئے گا۔ اور جب وہ قومی مفاد کو اہمیت دیں تو وہ باہم متحد رہیں گے۔ قوم کے وسیع تر مفاد کا احساس انفرادی اختلافات پر غالب آجاتا ہے۔ لوگ اختلاف کے باوجود متحد رہتے ہیں۔ لوگ اختلاف کے باوجود اپنے اپنے اختلاف کو اپنی ذات تک رکھتے ہیں، وہ اپنے اختلاف کو اجتماعی تعلق میں موثر نہیں ہونے دیتے۔

ماضی اور حال

ہارون الرشید (۷۶۶ - ۸۰۹) عباسی دور کا مشہور خلیفہ ہے۔ اس کی حکومت مشرق میں چین سے لے کر مغرب میں اٹلانٹک تک پھیلی ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے بادل کے ایک ٹکڑے کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا تو اس کی زبان سے نکلا : امطرِی حَیث شئتِ فسیأتینی خراجكِ (جہاں چاہے جاکر برس، تیرا خراج میرے ہی پاس آئے گا)

خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں بغداد دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر تھا۔ اس نے فرانس کے بادشاہ شارلیمان (۷۴۲ - ۸۱۴) کے لیے ایک گھڑی بطور تحفہ بھیجی تھی۔ یہ گھڑی پانی سے چلتی تھی اور وقت بتانے کے لیے آواز کرتی تھی۔ اس کو دیکھ کر شارلیمان کے درباری حیران رہ گئے۔ وہ اس کی تشریح نہ کر سکے۔ انھوں نے گمان کیا کہ اس گھڑی کے اندر ایک شیطان ہے جو اس کو حرکت دیتا ہے (اهدى لشارلمان ساعة مائية دقاقة۔ احتار رجال شارلمان فى تفسيرها وظنوا أن فيها شيطاناً يحركها)

خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ کا ایک واقعہ عرب تاریخوں میں نقل کیا گیا ہے، اس زمانہ میں نقفور اوّل (Nicephorus I) روم کی باقی ماندہ سلطنت کا جانشین تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس کی حکومت عباسی خلافت کو جو خراج دے رہی تھی، اس کو روک دے۔ اس نے ہارون الرشید کو ایک خط لکھا۔ اس کا مضمون یہ تھا :

من نقفور ملك الروم إلى هارون ملك العرب۔ اما بعد فإن الملكة التى كانت قبلى اقامتك مقام الرُّخ واقامت نفسها مقام البيذق۔ فحملت اليك اموالها احمالا۔ وذلك لضعف النساء وحمقهن۔ فاذا قرأت كتابى فاردد ما حصل قبلك من اموالها والا فالسيف

شاہ روم نقفور کی طرف سے شاہ عرب ہارون کے نام
اس کے بعد یہ ہے کہ مجھ سے پہلے جو ملکہ تھی اس نے تم کو رخ (خیالی قسم کا بڑا جانور) کی حیثیت دے دی اور اپنے آپ کو بیذق (شطرنج کا پیادہ) سمجھ لیا۔ چنانچہ اپنا مال لاد کر تمہارے پاس بھیج دیا۔ یہ عورتوں کی کمزوری اور ان کی بے وقوفی کی وجہ سے ہوا۔ پس جب تم میرے اس کو پڑھو تو اس کا جو مال تم کو اس

بینا و بینک۔ (تاریخ الخلفاء للسیوطی، ۲۶۶) سے پہلے پہنچا اس کو مجھے لوٹا دو۔ ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہے۔

ہارون الرشید نے جب اس خط کو پڑھا تو وہ سخت غضب ناک ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے قلم دوات منگوائی۔ اور اسی خط کی پشت پر اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھ کر بھیج دیے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ہارون امیرالمومنین کی طرف سے رومی کتے نقفور کے نام، اے کافر عورت کے بچے، میں نے تمہارا خط پڑھ لیا۔ اس کا جواب تم جلد ہی دیکھ لوگے (۲۶۸)

اس جواب کو بھیجنے کے فوراً بعد خلیفہ نے تیاری کا حکم دے دیا۔ اور پھر ایک طاقت ور فوج لے کر تیزی سے رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے نقفور سے کئی لڑائیاں لڑکر اس کو بری طرح شکست دی۔ یہاں تک کہ وہ مجبور ہوگیا کہ دوبارہ بغداد کو خراج دینے پر راضی ہو جائے۔

نقفور سے پہلے ملکہ آئرین (Irene) رومی تخت کی وارث تھی۔ ۸۰۲ میں ایک انقلاب ہوا اور ملکہ آئرین کی حکومت ختم ہوگئی۔ نقفور ۸۱۱ تک حکمراں رہا:

When Nicephorus withheld the tribute that Irene had agreed to pay the Baghdad calipah Harun ar-Rashid, was followed, and Arab forces defeated the Byzantine emperor at Crasus in Phrygia (805). In 806 Harun captured Heraclea, Tyana, and other places. Nicephorous was forces to agree to pay a yearly tribute of 30,000 gold pieces. (EB-VII/322)

جب نقفور نے اس خراج کو روک دیا جس کو ملکہ آئرین نے بغداد کے خلیفہ ہارون الرشید کو دینا منظور کیا تھا تو دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ عرب فوجوں نے بازنطینی بادشاہ کو ۸۰۵ میں کراس کے مقام پر شکست دی۔ ۸۰۶ میں ہارون نے ایشیائے کوچک پر ایک لاکھ ۳۵ ہزار سے زیادہ لشکر کے ساتھ حملہ کیا اور ہرقل اور تیانہ اور دوسرے مقامات پر قبضہ کرلیا۔ نقفور کو اس پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ بغداد کو سالانہ ۳۰ ہزار سونے کا سکہ ادا کرے۔

دورِ اول کے مسلمانوں کی طاقت کا راز صرف تلوار نہ تھی۔ ان کی طاقت کا اصل راز یہ تھا کہ وہ علم میں دوسری قوموں سے حیران کن حد تک آگے بڑھے ہوئے تھے۔ علم ہی کے ذریعہ آدمی حقیقتوں سے واقف ہوتا ہے۔ علم ہی کے ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کی منصوبہ بندی کر سکے۔ علم اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

رحم دل فاتح

۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء مسلم تاریخ کا نہایت اہم دن ہے۔ یہی وہ دن ہے جب کہ صلیبی طاقتوں کے ۸۸ سالہ قبضہ کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی دوبارہ بیت المقدس میں داخل ہوئے۔

۱۰۹۵ء میں پوپ نے یورپی قوموں کو صلیبی جنگ پر ابھارا تاکہ "مسیح کی مقدس قبر کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لیا جاسکے"۔ اس کے جواب میں یورپ کے مسیحی حکمراں جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہولناک لڑائیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ مسیحیوں نے فلسطین کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد فتح کے نشہ میں انھوں نے تمام انسانی قدروں کو پامال کر ڈالا۔ وہ مسلمانوں کو فلسطین سے بزور نکالنے لگے اور انھیں ہلاک کرنا شروع کیا۔

اس موضوع پر بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں چھپ چکی ہیں۔ حال میں ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ) میں اس کے بارہ میں ایک مفید معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون فرانسیسی مستشرق آلان روکو کے فرانسیسی مقالہ کا ترجمہ ہے جو مصطفیٰ کمال الجابری نے کیا ہے۔

صلاح الدین ایوبی ۲۷ نومبر ۱۱۷۴ء کو دمشق پہنچے۔ پھر وہ حلب گئے۔ جلد ہی اپنی خصوصیات کی بنا پر انھیں دمشق، حلب، قاہرہ کے حاکم کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ انھوں نے دمشق کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ خلیفہ بغداد نے ان کو مصر اور شام کا فرماں روا تسلیم کر لیا۔ اپنی صفات کی بنا پر وہ عامۃ الناس کے محبوب بن گئے۔ ان کو سیف الاسلام کہا جانے لگا۔

صلاح الدین نے اس کے بعد اپنی فوج کو طاقتور انداز میں منظم کیا۔ اور پھر انھوں نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا جو فلسطین پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ ارض مقدس سے صلیبی طاقتوں کو نکال کر رہیں گے۔ اعلیٰ ترین جنگی منصوبہ ثابت کرتا ہے کہ صلاح الدین جنگی امور میں عبقری مہارت رکھتے تھے (خطة حربية عالية المستوى تدل على عبقرية صلاح الدين العسكرية) انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ صلیبی فوجوں کو پانی سے محروم کر دیا اور حطین کے مقام پر ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

صلاح الدین نے مسلسل فتوحات حاصل کرتے ہوئے اکتوبر ۱۱۸۷ء میں قلعۃ القدس پر قبضہ کرلیا۔ صلیبیوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں فلسطین کے مسلمانوں پر ہر قسم کے ظلم کیے تھے۔ مگر صلاح الدین نے فتح حاصل کرنے کے بعد ان کے خلاف کوئی بھی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ ان کی تلوار صلیبی جارحیت کے خلاف میان سے نکلی تھی، صلیبی جارحیت کو ختم کرتے ہی وہ دوبارہ میان میں چلی گئی۔

فرانسیسی مستشرق نے لکھا ہے کہ صلاح الدین نے مسیحیوں کے ساتھ انتہائی شریفانہ معاملہ کیا۔ قدس میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے حکم جاری کیا کہ اسپتالوں میں جو مسیحی لوگ زیر علاج ہیں، ان کا علاج جاری رکھا جائے۔ تمام بڑے بڑے چرچ مسیحیوں کے قبضہ میں بدستور باقی رہے۔ انھوں نے ۱۵۰۰ مسیحیوں کے اوپر سے جزیہ معاف کر دیا، کیوں کہ انھوں نے کہا تھا کہ وہ مفلسی کی وجہ سے جزیہ نہیں دے سکتے۔ انھوں نے ایک بڑے صلیبی عہدیدار کو اجازت دی کہ وہ چرچ کے خزانہ کو اپنے ساتھ جہاں چاہے لے جائے۔ وغیرہ

صلیبی فوجی جو گرفتار ہو گیے تھے، ان کی عورتیں صلاح الدین کے پاس آئیں۔ انھوں نے صلاح الدین کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا اور اپنے فوجی شوہروں کی رہائی کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے تمام فوجیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ مضمون ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

فرانسیسی مورخ گستاو لیبان یہ کہنے میں بالکل حق بجانب تھا کہ تاریخ نے عربوں سے زیادہ رحم دل فاتح نہیں دیکھا

فقد كان المورخ الفرنسي (جوستاف لوبون) على حق عندما قال جملته المأثورة: لم يعرف التاريخ فاتحاً ارحم من العرب (صفحہ ۱۰۱)

جنگ کے بارہ میں یہی اسلام کا اصول ہے۔ اسلام جارحیت کے خلاف دفاع کی مکمل اجازت دیتا ہے۔ مگر جب جارح کی تلوار ٹوٹ جائے تو اس کے بعد اہل اسلام بھی اپنی تلوار توڑ لیتے ہیں۔ اسلام میں دفاع ہے مگر جارحیت نہیں۔ اسلام میں حفاظتی کارروائی ہے مگر انتقامی کارروائی نہیں۔ اسلام میں اپنا حق وصول کرنا ہے مگر اسلام میں یہ جائز نہیں کہ آدمی دوسرے کے خلاف دست درازی کرنے لگے۔ اسلام جس دل میں اترتا ہے وہ اس کو مثبت احساسات میں جینے والا انسان بناتا ہے نہ کہ منفی احساسات میں جینے والا انسان۔

ظالم کا دل ہل گیا

ساتویں صدی ہجری میں تاتاری قبائل نے اسلامی سلطنت پر حملہ کیا اور عراق، ایران، ترکستان میں مسلم تہذیب وسلطنت کو زیر وزبر کرڈالا۔ مگر اس کے بعد اللہ نے ان کے دلوں کو نرم کیا اور تقریباً پوری کی پوری قوم مسلمان ہوکر اسلام کی پاسبان بن گئی۔ اس زمانہ کے دعوتی واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ شیخ جمال الدین ایرانی کہیں جارہے تھے۔ اتفاق سے انھیں دنوں ایک تاتاری شہزادہ تغلق تیمور شکار کے لئے نکلا ہوا تھا۔ یہ شہزادہ تاتاریوں کی چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا جو ایران پر حکومت کررہی تھی۔ شیخ جمال الدین ایرانی چلتے ہوئے اس علاقہ میں پہنچ گئے جہاں شہزادہ شکار کھیل رہا تھا۔ تاتاری اس زمانہ میں ایرانیوں کو منحوس سمجھتے تھے۔ شہزادہ کے سپاہیوں نے شکارگاہ میں ایک ایرانی کی موجودگی کو برا فال سمجھا اور ان کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد وہ اس گستاخ ایرانی کو شہزادہ کے پاس لے گئے۔ شہزادہ ان کو دیکھ کر سخت برہم ہوا۔ غصہ کی حالت میں اس کی زبان سے نکلا: تم ایرانیوں سے تو ایک کتا اچھا ہے۔ شیخ جمال الدین تاتاری کے اس نفرت انگیز سوال کو سن کر سنجیدہ انداز میں بولے: اگر ہم کو سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے۔

تاتاری اگرچہ وحشی تھے مگر ان میں فطری مردانگی کا جوہر موجود تھا۔ وہ منافقت سے خالی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ کا یہ جواب تغلق تیمور کے لئے سخت جھنجھوڑنے والا ثابت ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ جب میں شکار سے فارغ ہوجاؤں تو اس ایرانی کو میری خدمت میں حاضر کرو۔ شیخ جمال الدین جب حاضر کئے گئے تو وہ ان کو تنہائی میں لے گیا اور ان سے پوچھا کہ یہ دین کیا ہے۔ شیخ جمال الدین نے نڈر ہوکر اس کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔ اس گفتگو نے تاتاری شہزادہ کا دل ہلا دیا۔ بے دینی کی حالت میں مرنا اسے بڑا خطرناک معلوم ہونے لگا۔ وہ اس پر آمادہ ہوگیا کہ اسلام قبول کرلے۔ تاہم ابھی وہ ولی عہد تھا، بادشاہ نہ تھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت اگر میں اسلام قبول کرتا ہوں تو میں اپنی رعایا کو اسلام کے دین پر نہیں لاسکتا۔ اس نے شیخ جمال الدین سے کہا: اچھا اس وقت تم جاؤ۔ جب تم سنو کہ میری تاج پوشی ہوئی ہے اور میں تخت پر بیٹھ گیا ہوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا۔

شیخ جمال الدین اپنے گھر واپس آگئے اور اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب کہ تغلق تیمور کی تخت نشینی کی خبر انھیں معلوم ہو۔ مگر یہ نوبت ان کی زندگی میں نہیں آیا۔ یہاں تک کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہوگئے۔ اس وقت انھوں نے اپنے لڑکے شیخ رشید الدین کو بلایا اور تاتاری شہزادہ کا قصہ بتا کر کہا کہ دیکھو میں ایک مبارک گھڑی کا انتظار کررہا تھا۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آنا میری زندگی میں مقدر نہیں۔ اس لئے میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ جب تم سنو کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہوئی ہے تو تم وہاں جانا اور اس کو میرا اسلام کہنا

اور بے خوفی کے ساتھ اس کو شکار کا واقعہ یاد دلانا جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ شاید اللہ اس کا سینہ حق کے لئے کھول دے۔

اس کے بعد شیخ جمال الدین کا انتقال ہوگیا۔ باپ کی وصیت کے مطابق ان کے لڑکے شیخ رشید الدین تاتاری شہزادہ کی تخت نشینی کا انتظار کرنے لگے۔ جلد ہی ان کو خبر ملی کہ تغلق تیمور تخت پر بیٹھ گیا ہے۔ اب وہ اپنے وطن سے روانہ ہوئے۔ منزل پر پہنچے تو دربانوں نے خیمہ کے اندر جانے سے روک دیا۔ کیوں کہ ان کے پاس دربانوں کو بتانے کے لئے کوئی بات نہ تھی کہ وہ کیوں بادشاہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے یہ کیا کہ خیمہ کے قریب ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔

ایک روز وہ فجر کے لئے اٹھے۔ اول وقت تھا اور فضا میں ابھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ انھوں نے بلند آواز سے اذان دینا شروع کیا۔ یہ آواز خیمہ کے اس حصہ تک پہنچ گئی جہاں شاہ تغلق تیمور سو رہا تھا۔ بادشاہ کو ایسے وقت میں یہ آواز بے معنی شور معلوم ہوئی۔ اس نے اپنے ملازموں سے کہا کہ دیکھو یہ کون پاگل ہے جو اس وقت ہمارے خیمہ کے پاس شور کر رہا ہے۔ اس کو پکڑ کر ہمارے پاس حاضر کرو۔ چنانچہ شیخ رشید الدین فوراً بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دئے گئے۔

اب بادشاہ نے ان سے سوال و جواب شروع کیا کہ تم کون ہو اور کیوں ہمارے خیمہ کے پاس شور کر رہے ہو۔ شیخ رشید الدین نے اپنے والد شیخ جمال الدین کی پوری کہانی سنائی اور کہا کہ آپ کے سوال کے جواب میں جب میرے والد نے کہا تھا کہ اگر ہم کو سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے تو آپ نے کہا تھا کہ اس وقت میں کچھ نہیں کہتا مگر جب میری تخت نشینی ہو جائے تو تم میرے پاس آنا۔ مگر اس کے انتظار میں میرے والد کا آخری وقت آگیا۔ اب ان کی وصیت کے مطابق میں آپ کے پاس وہ بات یاد دلانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

بادشاہ نے پورے قصہ کو غور کے ساتھ سنا۔ آخر میں بولا کہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں تمھارے انتظار میں تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے وزیر کو بلایا اور کہا کہ ایک راز میرے سینہ میں تھا جس کو آج اس ایرانی فقیر نے یاد دلایا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اسلام قبول کر لوں۔ تمھاری کیا رائے ہے۔ وزیر نے کہا کہ میں بھی یہی راز اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوں۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ سچا دین یہی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ اور وزیر دونوں شیخ رشید الدین کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد بقیہ درباریوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ بادشاہ کے قبول اسلام کے بعد پہلے ہی دن ایک لاکھ ساٹھ ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا اور بالآخر ایران کی پوری تاتاری قوم نے بھی۔

تاریخ کا ایک صفحہ

چودھویں صدی عیسوی میں دو بڑے مسلم حکمراں تھے۔ ایک تیمور لنگ (۱۴۰۵-۱۳۳۶) اور دوسرا بایزید اول (۱۴۰۲-۱۳۸۹) تیمور لنگ سمرقند (وسط ایشیا) میں پیدا ہوا۔ وہ چنگیز خاں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بایزید اول اناتولیہ (ترکی) میں پیدا ہوا۔ اس کا دار السلطنت ایڈریانوپل تھا۔

ان دونوں مسلم حکمرانوں کے درمیان ایک نہایت ہولناک جنگ ہوئی جس کو تاریخ میں جنگ انگورہ (Battle of Angora) کہا جاتا ہے۔ انگورہ موجودہ انقرہ کا انگریزی نام ہے۔ تیمور نے چاہا کہ وہ بایزید کی سلطنت کے ایشیائی علاقہ پر قبضہ کر لے۔ یہاں سے دونوں میں اختلافات پیدا ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف کارروائی کرنے لگے۔ بایزید نے تیمور کے دشمنوں کو اپنے یہاں پناہ دی۔ تیمور نے بایزید کے دشمنوں سے تعلق قائم کیا، وغیرہ۔

اس قسم کی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ جولائی ۱۴۰۲ میں انگورہ (انقرہ) کے مقام پر دونوں کی فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ دونوں طرف نہایت بہادر لوگ تھے۔ چنانچہ دونوں کے درمیان سخت ہولناک لڑائی ہوئی۔ ایک مورخ کے الفاظ میں گویا دو پہاڑ آپس میں ٹکرا گیے۔ دونوں طرف کے تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی مارے گیے۔ آخر کار بایزید کو شکست ہوئی۔ وہ گرفتار ہوا اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا۔

چودھویں صدی عیسوی میں ساری دنیا میں تیمور اور بایزید کے برابر کوئی طاقتور بادشاہ موجود نہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان جنگ چھڑی تو عالم یہ تھا کہ دور تک خون اور لاشوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس ہولناک جنگ کے سلسلہ میں کچھ لوگ تیمور کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور کچھ لوگ بایزید کو۔ تاہم ذمہ دار جو بھی ہو، نتیجہ بہر حال ایک تھا۔ وہ یہ کہ اس لڑائی سے عالم اسلام کو شدید ترین نقصان پہونچا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یورپ جو عثمانی ترکوں کے ذریعہ اسلامی براعظم بننے جارہا تھا، وہ اس باہمی جنگ کے نتیجہ میں عیسائی براعظم بن کر رہ گیا۔

جنگ کا فیصلہ ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ کو ہوا۔ بایزید گرفتار ہو گیا۔ تیمور نے اس کو ایک لوہے کے

کٹہرے میں بند کروایا۔ تیمور اپنے سفروں میں اس کٹہرے کو ساتھ ساتھ لے جاتا تھا تاکہ اس کی تشہیر کرے۔ سلطان بایزید اس رسوائی کو برداشت نہ کرسکا۔ گرفتاری کے صرف آٹھ ماہ بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ خود تیمور بھی اپنی فتح کے ڈھائی سال بعد اس دنیا سے رخصت ہوکر وہیں چلا گیا جہاں اس نے اپنے مفتوح سلطان کو پہونچایا تھا۔ دنیا میں بظاہر ایک فاتح تھا اور دوسرا مفتوح۔ مگر آخرت نے دونوں کے فرق کو ختم کردیا۔ آخرت میں دونوں یکساں طور پر خدا کے بندے کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش کر دیئے گیے۔

تیمور اور بایزید دونوں نہایت بہادر تھے۔ تیمور کی ہیبت مشرقی دنیا پر چھائی ہوئی تھی اور بایزید کی ہیبت مغربی دنیا پر جس نے اسلام کے حدود دریائے ڈینوب (ہنگری) تک پہونچا دیئے تھے۔

اگر ایسا ہوتا کہ تیمور اپنے عمل کا میدان مشرق کو بناتا اور بایزید مغرب کی سمت میں آگے بڑھتا تو وہ دونوں پورے عالم کو اسلام کے سایہ میں لانے کے لیے کافی ہوجاتے۔ مگر آپس کی لڑائی نے اس امکان کو واقعہ بننے نہیں دیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے تیمور کے تذکرے کے ذیل میں لکھا ہے :

By defeating the Ottoman Sultan Bayezid at Angora (modern Ankara) in 1402 and thus preventing him from extending his domain into Europe, the fall of Constantinople and the death agony of Byzantium were delayed half a century by this Muslim nomad (18/242).

یعنی تیمور نے عثمانی سلطان بایزید کو انگورہ (موجودہ انقرہ) کے مقام پر ۱۴۰۲ میں شکست دی۔ اس طرح اس نے بایزید کو یورپ میں اپنا اقتدار بڑھانے سے روک دیا۔ اس کے نتیجہ میں قسطنطنیہ کی فتح اور بازنطینی سلطنت کا خاتمہ نصف صدی تک کے لیے موخر ہوگیا۔

مسلمان اکثر دوسری قوموں کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو جتنے بھی نقصان پہونچے ہیں، سب اپنوں کی وجہ سے پہونچے ہیں۔ مسلمانوں کی آپس کی لڑائیاں مسلمانوں کی بربادی کا سب سے بڑا سبب ہیں، گزرے ہوئے دور میں بھی اور حال کے زمانہ میں بھی۔ مگر تاریخ کا یہی سب سے بڑا سبق ہے جس سے مسلمانوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

ترک فاتح

ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا جو اب استانبول کہا جاتا ہے۔ یہ مسیحی دنیا کے لیے سب سے زیادہ ہلادینے والا واقعہ تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک یونانی کتبہ میں اس کے بارے میں یہ الفاظ لکھے گئے کہ اس سے زیادہ ہولناک واقعہ نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہوگا :

There has never been and there never will be
a more dreadful happening (p. 336).

حضرت عثمان کی خلافت (۶۵۶ - ۶۴۴) کے زمانہ میں مسلمان ترکی میں داخل ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں انھوں نے ترک علاقہ میں مزید پیش قدمی کی۔ مگر اس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ انتہائی محفوظ جغرافیہ اور بے حد مضبوط قلعہ کی بنا پر اتنا مستحکم تھا کہ بار بار کوشش کے باوجود مسلمان اس کو مسخر نہ کر سکے۔ اس کی تسخیر ۸۰۰ سال بعد صرف ۱۴۵۳ میں ممکن ہو سکی۔

ترکی کا عثمانی سلطان محمد دوم جو محمد فاتح کے نام سے مشہور ہے، وہ پہلا شخص ہے جس نے اس طویل مہم کو کامیابی تک پہنچایا۔ اس نے اس مقصد کے لیے نہایت گہرا منصوبہ بنایا۔ سلطان محمد ۱۴۵۱ میں تخت پر بیٹھا جو اس وقت ادرنہ (Edirne) میں تھا۔ اس نے خاموش اور مسلسل عمل کے ذریعہ تمام ممکن سیاسی اور فوجی تدبیریں اس مقصد کے لیے مہیا کیں۔

۱۴۵۲ کا پورا سال اس نے باسفورس کے کنارے ایک نیا قلعہ تعمیر کرنے میں صرف کیا جہاں سے جنگی کارروائیوں کو منظم کیا جا سکے۔ یہ قلعہ بعد کو قلعہ رومیل (Rameli Hisari) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ۱۳۱ جنگی جہازوں کا ایک طاقتور بیڑا تیار کروایا تاکہ سمندر کے راستہ سے موثر حملہ کیا جا سکے۔ اس نے ہنگری کے ایک استاد اربان (Urban) کو بلا کر اتنی بڑی توپ تیار کرائی جو اس وقت کے یورپ میں ایک نادر چیز تھی۔ یہ توپ سازی بے حد اہم تھی، کیونکہ اسی کے ذریعہ قسطنطنیہ کی مضبوط سنگی فصیل توڑی جا سکی۔

اس قسم کی مختلف ضروری تیاریوں کے علاوہ اس نے مزید یہ کیا کہ بوقت جنگ یونان اور ہنگری کو غیر جانب دار رکھنے کے لیے ان سے امن معاہدے کیے جن کی شرائط یک طرفہ طور پر ان کے مفاد میں تھیں :

To keep Venice and Hungary neutral, he signed peace treaties favourable to them (11/860).

یہ عین وہی تدبیر تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ حدیبیہ کے وقت اختیار فرمائی، اور جس کے ذریعہ آپ نے مکہ کے قریش کو خیبر کے یہودیوں سے کاٹ دیا تھا۔ اس معاہدہ کے تحت قریش اس کے پابند ہو گئے تھے کہ بوقت جنگ وہ یہود کی مدد نہیں کریں گے۔

ان تمام تیاریوں کے بعد سلطان محمد خاموش نہیں بیٹھا۔ بلکہ اس نے جنگی کارروائی کی کمان براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پوری مہم کے دوران وہ بذاتِ خود اس میں شریک رہا۔ قسطنطنیہ کی مہم کی تیاری اور اس کی کارروائیوں کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اس کو تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس زبردست منصوبہ بندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح ہو گیا۔ بازنطینی شہنشاہیت کا آخری تاجدار قسطنطین (Constantine XI) جنگ کرتا ہوا شہر کے دروازے پر مارا گیا۔ ترکی میں مسلمانوں کی فتح تکمیل کو پہنچ گئی۔

اس فتح کے بعد ترکی کی راجدھانی ادرنہ (ایڈریانوبل) کے بجائے قسطنطنیہ قرار پائی اور آج تک وہ وہیں قائم ہے۔ اب اس کا نام استانبول ہے۔ قسطنطنیہ گیارہ سو سال سے زیادہ مدت تک مسیحی سلطنت کی راجدھانی تھا۔ اس کے بعد وہ مسلم سلطنت کی راجدھانی بنا۔ تقریباً پانچ سو سال تک وہ عظیم عثمانی خلافت کی راجدھانی اور پورے عالم اسلام کی سیاسی طاقت کا مرکز رہا ہے۔ اس کی یہ حیثیت پہلی بار صرف جنگ عظیم اول (۱۸-۱۹۱۴) میں ختم ہوئی۔

فتح مکہ (۶۳۰ء) سے لے کر فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳) تک اسلامی تاریخ کے تمام بڑے بڑے فاتحانہ واقعات گہری حکمت اور عظیم منصوبہ بندی کے ذریعہ انجام پائے ہیں۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کی بات ہے کہ مسلمان تدبیر اور منصوبہ بندی کے بغیر محض جوش وخروش کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پر بالاکوٹ مارچ (۱۸۳۱) سے لے کر اجودھیا مارچ (۱۹۸۹) تک ان کے تمام اقدامات صرف ناکامی پر ختم ہو رہے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ مومن کی فراست سے بچو۔ کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ مومن کا ایمان اس کو زیادہ بہتر تدبیر کے قابل بنا دیتا ہے۔

ناکامیوں کے بعد

ظہیر الدین محمد بابر (۱۵۳۰ - ۱۴۸۳) فرغانہ میں پیدا ہوا۔ یہ علاقہ اس وقت ازبکستان (ازبیک) میں شامل ہے۔ باپ کے واسطہ سے اس کا سلسلہ نسب تیمور سے ملتا ہے اور ماں کے واسطہ سے چنگیز خاں سے۔ بابر کا باپ عمر شیخ مرزا فرغانہ کا حاکم تھا۔ اُس وقت یہ مقام کوہ ہندوکش کے شمال میں ایک چھوٹے پرگنہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

فرغانہ کے پڑوس میں سمرقند تھا جو تیمور کی قدیم راجدھانی تھا۔ یہاں محمد شیبانی خاں کی حکومت تھی جو چنگیز خاں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ بابر کا باپ مستقل اس کوشش میں رہا کہ وہ سمرقند کو فتح کرکے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ باپ کی وفات پر ۱۴۹۴ میں بابر فرغانہ کا حاکم بنا جب کہ اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ باپ کی پیروی میں اس نے سمرقند پر قبضہ کرنے کے لیے اس پر کئی حملے کیے۔ مگر ۱۵۰۱ میں اس کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ اس نے خود اپنی موروثی سلطنت فرغانہ کو بھی کھو دیا۔

ایک مورّخ نے لکھا ہے کہ ایک کم سن بادشاہ کی حیثیت سے بابر نے فرغانہ کو کھو دیا۔ وہ مصیبتوں کے ایک دور میں داخل ہوگیا۔ اس کو خود اپنے پدری اور مادری چچاؤں سے لڑائی لڑنی پڑی۔ مگر ۲۰ سالہ مصیبت اور جنگ کے دوران اس نے اپنے حریفوں (ترک، مغل، ایرانی اور افغانی) سے کامیاب جنگی تدبیریں اور حربی طریقے سیکھ لیے۔ اس نے ان طریقوں میں سائنٹفک امتزاج پیدا کیا۔ سالہا سال کی شکستوں اور وطن سے محرومی اور طرح طرح کی مشکلات کے نتیجہ میں وہ ایک اچھا فوجی جنرل بن گیا۔ اپنے باپ دادا کے علاقہ کو حاصل کرنے کے بارہ میں اپنے منصوبہ کی ناکامی کے بعد بابر نے اپنی توجہ ہندستان کی طرف موڑ دی:

As a boy king he lost Farghana and passed through a period of adversity, having to fight his own paternal and maternal uncles. During 20 years of adversity and warfare Babur trained himself by appropriating military tactics and modes of warfare of his adversaries – Turks, Mongols, Persians, and Afghans, and he made a scientific synthesis of these systems. He became a good general through a career of many defeats and through years of homeless wanderings, privations and hardships... Foiled in his design of recovering his ancestral domain in Central Asia, Babur turned his attention to India. (9/378).

بابر نے پہلی بار ۱۵۱۹ میں ہندستان پر حملہ کیا۔ اس کی پیش قدمی جاری رہی۔ یہاں تک کہ ۱۵۲۶ میں اس نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر کے ہندستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اپنے وطن فرغانہ کو اس نے ایک شکست خوردہ انسان کی حیثیت سے چھوڑا تھا، مگر ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ کو آگرہ میں جب اس کا انتقال ہوا تو تاریخ اس کو اپنے صفحات میں ایک فاتح بادشاہ کی حیثیت سے درج کر چکی تھی۔

بابر کو کامیابی اس حوصلہ مندانہ عمل کی بنا پر ہوئی کہ اس نے اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کیا۔ اس نے خود ناکامی کے اندر وہ پہلو تلاش کر لیے جو اس کو عظیم تر کامیابی کی طرف لے جانے والے ہوں۔

بابر کو جب اپنے حریفوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو اس نے شکایتی انداز اختیار نہیں کیا۔ اس نے ایسا نہیں کیا کہ وہ ان کی سازشوں اور ان کے تخریبی منصوبوں کی فہرست مرتب کرنے لگے۔ وہ اپنے حریفوں کے خلاف لفظی گولہ باری میں مشغول ہو جائے۔

اس کے بجائے بابر نے اپنا ذہن اس سوچ میں لگایا کہ میرے حریفوں کو میرے مقابلہ میں کامیابی کیونکر حاصل ہوئی۔ میری ہار اور ان کی جیت کا سبب کیا تھا۔ بابر کی اس سوچ نے اس کو بتایا کہ اس کے حریف زیادہ کارگر تدبیروں کو جانتے تھے۔ انھوں نے زیادہ موثر حربے استعمال کر کے اس کو ہرا دیا۔

اب بابر نے اپنے حریف کے حربوں اور ان کی تدبیروں کو اپنانا شروع کیا۔ اس نے مزید غور و تجربہ کے ذریعہ ان کو مزید ترقی یافتہ بنایا۔ اس طرح زیادہ بہتر طور پر مسلح ہو کر اس نے ایک نئے وسیع تر میدان (برصغیر ہند) کی طرف رخ کیا۔ اس کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ اپنے وطن میں اس نے جتنا کھویا تھا، اس سے بہت زیادہ اس نے وطن کے باہر حاصل کر لیا۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں دوسروں سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس لیے ناکامیوں کا پیش آنا لازمی ہے۔ کامیاب وہ ہے جو اپنی ناکامی کو اپنے لیے غذا بنا سکے۔ وہ کھونے میں پانے کا راز دریافت کر لے۔

مومن سب سے زیادہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کر سکے۔ کیونکہ مومن کا اللہ پر بھروسہ اس کو کبھی مایوس اور پست ہمت نہیں ہونے دیتا۔ وہ ہر حال میں پرامید رہتا ہے، کیونکہ ہر حال اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور وہ ضرور اس کا ساتھ دے کر اس کو فتح و کامیابی عطا فرمائے گا۔

میدانِ جنگ میں نماز

اورنگ زیب عالم گیر (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) مشہور مغل حکمراں ہے۔ اس کے زمانہ میں مغل سلطنت کو سب سے زیادہ وسعت حاصل ہوئی۔ اس کی زندگی کا تقریباً نصف حصہ لڑائیوں میں گزرا۔ اس کی بہادری کے بہت سے عجیب واقعات تاریخ کی کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں۔

اورنگ زیب نوجوانی کی عمر ہی میں اپنی امتیازی صلاحیتوں کی بنا پر شاہی خاندان میں نمایاں ہوگیا تھا۔ جب وہ نوجوان تھا، اس زمانہ میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مست ہاتھی اس کے سامنے آگیا۔ اس وقت وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ پہلے اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے ہاتھی کا مقابلہ کرنا چاہا۔ لیکن گھوڑا بدکنے لگا۔ اورنگ زیب اس سے ہراساں نہیں ہوا۔ وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور زمین پر آکر تلوار کے ذریعہ ہاتھی کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے ہاتھی کو زیر کرلیا۔

انھیں صفات کی بنا پر شاہ جہاں اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ نوجوانی کی عمر ہی سے اس کو بڑی بڑی مہموں پر بھیجنے لگا تھا۔ اورنگ زیب لڑائی کے گُر سے خوب واقف تھا۔ وہ دشمن کا مقابلہ نہایت اطمینان کے ساتھ کرتا تھا اور کبھی گھبراتا نہ تھا۔ مستقل مزاجی کی صفت اس کے اندر کمال درجہ میں تھی۔ ان تمام صفات کے باوجود وہ انتہائی سادہ مزاج تھا اور بالکل معمولی زندگی گزارتا تھا۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ جزیرہ نمائے ہند میں (اورنگ زیب کے زمانہ میں) اگرچہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے کچھ ہولڈنگ رکھتی تھی، مگر کابرٹ کے زمانہ میں اور اس کے بعد تک فرانسیسیوں کی پیش قدمی بہت سست رہی۔ اس کی وجہ جزئی طور پر یہ تھی کہ آخری مغل شہنشاہ اورنگ زیب انڈیا پر حکومت کررہا تھا اور یہاں غالب تھا :

In the Indian peninsula, where the English East India Company had holdings, French progress was slow in Colbert's time and after, partly because the last great Mughal emperor, Aurangzeb, reigned and dominated India. (4/887)

اورنگ زیب کی زندگی کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو ۱۶۴۷ میں پیش آیا۔ جب کہ اس نے عین میدان کارزار میں گھوڑے سے اتر کر نماز ادا کی۔ ڈاکٹر آر سی مجمدار اور ڈاکٹر ایچ سی رائے چودھری نے اپنی مشترک کتاب (An Advanced History of India) میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں درج کیا ہے :

Aurangzeb was a pious Muslim, and with the zeal of Puritan he scrupulously observed the injuctions of the Holy Qur'an. Once during the Balkh campaign he knelt down to finish his prayers at the proper time, though the fighting was going on all around him. (p. 501-502)

اورنگ زیب ایک پارسا مسلمان تھا۔ اور ایک سخت محتاط مذہبی انسان کی طرح جوش کے ساتھ وہ مقدس قرآن کے احکام کی اطاعت کرتا تھا۔ ایک بار بلخ کے معرکہ کے دوران وہ زمین پر جھک گیا تاکہ ٹھیک وقت پر اپنی نماز کو مکمل کرے۔ اگرچہ اس وقت اس کے چاروں طرف لڑائی جاری تھی۔

جنگ وہ لمحہ ہے جب کہ ہر طرف تیر، تلوار اور نیزوں کی جھنکار ہوتی ہے۔ چاروں طرف قتل اور خون کا بھیانک منظر دکھائی دیتا ہے۔ زندگی اور موت دونوں اتنے قریب آجاتے ہیں کہ دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا، اس وقت عین میدانِ جنگ میں نماز کے لیے کھڑا ہونا اور اطمینان کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرنا ایک انتہائی حیرت انگیز واقعہ ہے۔ وہ کونسی طاقت ہے جو ایک انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اس قسم کا حیرت ناک واقعہ ظہور میں لاسکے۔

یہ اللہ پر ایمان کی طاقت ہے۔ ایک مومن جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اس وقت اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی کی حمایت میں آگیا ہے جو تمام طاقتوں سے زیادہ طاقتور ہے۔ جو ہر خطرہ کے مقابلہ میں اس کی طرف سے ناقابل تسخیر ڈھال بن سکتا ہے۔ یہ احساس مومن کے اندر بے پناہ اعتماد پیدا کر دیتا ہے۔ انسان اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو اپنے سامنے دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایمان ایک عظیم عقیدہ ہے اور اسی کے ساتھ ایک عظیم طاقت بھی۔

حسد کے نقصانات

بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء میں سلطان محمد بن تغلق سے بغاوت کرکے قائم ہوئی۔ اس کا بانی حسن گنگو تھا۔ حسن کا کہنا تھا کہ وہ ایران کے قدیم بادشاہ بہمن کی اولاد سے ہے۔ اس بنا پر اس کا خاندان بہمنی خاندان کہا جاتا ہے۔

حسن گنگو نے گلبرگہ کو اپنی راجدھانی قرار دیا اور اپنی سلطنت کے حدود کو بڑھانا شروع کیا۔ ۱۳۵۹ میں حسن گنگو کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد اس کا جانشین احمد شاہ بہمنی ہوا۔ اس نے شہر بیدر بسایا اور گلبرگہ کے بجائے بیدر کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔

دکن کی یہ بہمنی سلطنت ۱۸۰ سال تک رہی اور ۱۵۲۷ء میں ختم ہوگئی۔ اس سلطنت کا وزیر ۱۴۶۳ سے لے کر ۱۴۸۱ تک محمود گواں تھا۔ اس کا زمانہ بہمنی سلطنت کا سب سے زیادہ کامیاب زمانہ ہے۔ اس نے سلطنت کو مزید وسیع کیا اور اپنے تدبر سے اس کو نہایت مستحکم کیا۔ مورخین نے بالاتفاق اس کی اعلیٰ لیاقت کا اعتراف کیا ہے۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ "محمود گواں تاریخ ہند کے بہترین مدبروں اور منتظموں میں شمار کیا جاتا ہے" انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں :

The most notable personality of the period,
a leading administrator (9/372).

(اس عہد کی سب سے زیادہ ممتاز شخصیت، ایک اعلیٰ انتظام کار) این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا (۱۹۷۸) کے مصنفین نے ان الفاظ میں اس کے اخلاص کا اعتراف کیا ہے :

Though possessed of wide powers, Mahmud Gawan never abused his authority. By virtue of his skilful diplomacy and successful military operations, he brought the dominions of the Bahmanis to an extent never achieved by former sovereigns.
An Advanced History of India (1987) p. 354

اگرچہ محمود گواں کو نہایت وسیع اختیارات حاصل تھے مگر اس نے کبھی اپنے اختیار کا بے جا استعمال نہیں کیا۔ اپنی ماہرانہ سیاست اور اپنے کامیاب فوجی اقدامات کے ذریعہ اس نے بہمنی سلطنت کے

رقبہ کو ایسی حدود تک پہونچایا جو پچھلے حکمرانوں کے زمانہ میں کبھی نہیں پہونچا تھا۔

محمود گواں اس قدر محنت کا عادی تھا کہ وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا۔ اپنی ضرورتیں اس نے بہت محدود کرلی تھیں۔ چٹائی پر سوتا، مٹی کے برتن میں کھانا کھاتا اور نہایت سادہ زندگی گزارتا۔ اس کے ذاتی کتب خانہ میں تین ہزار کتابیں تھیں۔ اس نے بہمنی سلطنت کی راجدھانی بیدر میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنی تمام کتابیں وہاں بھیج دیں۔ مدرسہ کی عمارت کے آثار اب بھی بیدر میں موجود ہیں۔ اس کے زمانہ میں بہمنی سلطنت کو بہت ترقی ہوئی۔

محمود گواں کے زمانہ میں بہمنی تخت پر محمد شاہ سوم تھا۔ یہ بادشاہ نہایت آرام طلب اور ناکارہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا سارا انتظام عملاً محمود گواں کے ہاتھ میں آگیا۔ محمود گواں نے اس اقتدار کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ پھر بھی دربار کے امراء اس کے قوت و اثر کو دیکھ کر اس سے جلنے لگے۔ انھوں نے خفیہ طریقہ سے محمود گواں کی سرکاری مہر حاصل کرلی۔ اس کے بعد ایک جعلی خط اس کی مہر کے ساتھ تیار کیا جو وجے نگر کے راجہ رائے نرسنگھ کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ فرضی خط انھوں نے بادشاہ کو دکھایا اور کہا کہ وزیر غدار ہے۔ وہ بادشاہ کو تخت سے بے دخل کرنے کے لیے وجے نگر کے راجہ کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے۔

بادشاہ امیروں کے دھوکے میں آگیا۔ اس نے ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو اس لائق وزیر کو قتل کرا دیا۔ بعد کو بادشاہ کو پتہ چلا کہ اس نے غلطی کی ہے، اس کو بے حد صدمہ ہوا، یہاں تک کہ وہ خود بھی ایک سال کے اندر ۱۲ مارچ ۱۴۸۲ کو مر گیا۔

محمود گواں کے خلاف اس شرم ناک سازش کا اصل دماغ ملک نائب تھا۔ مگر محمود گواں کے بعد اس کو بھی چین نصیب نہ ہو سکا۔ اب دربار میں اس کے مخالفین پیدا ہوگیے۔ دوبارہ اس کے خلاف بھی سازش ہوئی اور ۱۴۸۶ میں ملک نائب کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ مقتول کے خاتمہ کے صرف پانچ سال بعد خود قاتل کا بھی ذلت کے ساتھ خاتمہ ہوگیا۔

محمود گواں کے قتل کے بعد بہمنی سلطنت دوبارہ سنبھل نہ سکی۔ ۱۵۲۴ء میں اس کے آخری حکمراں کی وفات کے ساتھ بہمنی سلطنت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد اس علاقہ میں بغاوتیں ہوئیں اور ایک سلطنت پانچ الگ الگ سلطنت میں تقسیم ہوگئی۔

عالی ظرفی

مظفر حلیم (متوفی ۹۳۳ھ) گجرات کا حاکم تھا اور محمود خلجی مانڈو (احمد آباد) کا۔ دونوں ہم زمانہ تھے۔ پاس پاس ہونے کی وجہ سے دونوں میں باہم لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ محمود خلجی اکثر گجرات پر حملہ کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس "خوبصورت اور سرسبز" ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کرلے۔ تاہم اسے اپنے ارادہ میں کامیابی نہ ہوسکی۔ اس درمیان میں ایک واقعہ پیش آیا جو بظاہر مظفر حلیم کے لئے بہت خوش کن تھا۔ وہ یہ کہ اس کے حریف محمود خلجی کے وزیر منڈلی رائے نے موقع پاکر بغاوت کردی۔ اس کی بغاوت کامیاب رہی، اس نے سلطان کو تخت سے بے دخل کردیا اور خود ملک پر قابض ہوگیا۔ تاہم سلطان محمود خلجی اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگیا۔

اب اس کے سامنے یہ سوال تھا کہ کیا کرے۔ اس کی نظر میں صرف ایک ہی شخص تھا جو اس نازک وقت میں اس کی مدد کرسکتا تھا اور یہ وہی سلطان مظفر حلیم تھا جس کے اوپر وہ اپنے اقتدار کے زمانہ میں بار بار حملے کرچکا تھا۔ سلطان محمود خلجی کو معلوم تھا کہ سلطان مظفر حلیم اگرچہ اس کا حریف ہے مگر وہ ایک بہادر اور شریف انسان ہے۔ اور شریف اور بہادر انسان کی یہ صفت ہے کہ وہ مدد مانگنے والے کی مدد کرتا ہے، خواہ وہ اس کا حریف اور دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

سلطان محمود خلجی نے کئی دن کے حیص بیص کے بعد بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ وہ سلطان مظفر حلیم کے پاس جائے گا اور اس سے مدد طلب کرے گا۔ وہ جرأت کرکے اس کے پاس پہنچا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے باغی وزیر کے خلاف اس کی مدد کرے۔

سلطان مظفر حلیم کو موقع تھا کہ وہ اپنے حریف کو ذلیل کرے۔ وہ طعن وتشنیع کرکے اس کے بارے میں اپنے سینہ کو ٹھنڈا کرے۔ مگر اس نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ وہ فوراً اپنے حریف سلطان کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ سلطان مظفر حلیم نے حکم دیا کہ اس کی فوج مانڈو کی طرف کوچ کرنے کے لئے تیار ہوجائے۔ اس نے محمود خلجی کو لیا اور خود اپنی فوج کے ساتھ مانڈو کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر وزیر منڈلی رائے کی فوج سے زبردست مقابلہ ہوا۔ بالآخر منڈلی رائے کی فوج نے ہتھیار ڈال دئے اور مانڈو دوبارہ فتح ہوگیا۔

اب فوجیوں کی فاتحانہ نفسیات نے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔ سلطان مظفر حلیم کے فوجی سرداروں نے کہا کہ یہ ملک اب آپ کا ہے۔ کیونکہ اس کو آپ کی فوجوں نے لڑ کر فتح کیا ہے۔ آپ اس کو محمود خلجی کے حوالے نہ کریں بلکہ اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا اعلان کر دیں۔ اس معاملہ میں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔

سلطان مظفر حلیم کے لئے یہ بہت نازک لمحہ تھا۔ تاہم اس نے جرأت سے کام لیا اور اپنے فوجی سرداروں کے اس مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کو یہ بات اپنی بہادری اور غیرت کے خلاف معلوم ہوئی کہ جس ملک کو اس نے سلطان محمود خلجی کے نام پر فتح کیا ہے، اس کو سلطان کے حوالے نہ کرے اور خود اس پر قابض ہو جائے۔ سلطان کی جو شرافت اس کی محرک بنی تھی کہ وہ اپنے دشمن کی مشکل وقت میں مدد کرے، وہی شرافت دوبارہ اس میں مانع ہوگئی کہ وہ دشمن کی کمزوری کا غلط فائدہ اٹھائے اور اس کی چیز کو خود اپنے قبضہ میں لے لے۔ اس کے ایک طرف شرافت تھی اور دوسری طرف ملک۔ اس نے اس سے انکار کر دیا کہ وہ ملک کو پانے کی خاطر اپنی شرافت کو کھو دے۔

تاہم سلطان مظفر حلیم کو اندیشہ تھا کہ اس کی فوج اگر مفتوحہ علاقہ میں ٹھہری رہی تو فتح کے جوش میں وہ کوئی نازک مسئلہ نہ کھڑا کر دے اور موجودہ فضا باقی نہ رہے۔ چنانچہ اس نے فوراً ایک حکم جاری کیا۔ اس حکم میں کہا گیا تھا کہ اس کی فوجوں کا کام اب یہاں ختم ہو چکا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی فوج کا کوئی شخص مزید آگے بڑھ کر مفتوحہ شہر کے اندر نہ داخل ہو۔ تمام کی تمام فوج بلا تاخیر اپنے وطن کی طرف واپس چلی جائے۔

اس حکم پر فوراً عمل ہوا۔ سلطان مظفر حلیم کی فوج اپنے فتح کیے ہوئے ملک کو سلطان محمود خلجی کے حوالے کر کے گجرات واپس چلی گئی۔ سلطان مظفر حلیم نے ایک مفتوحہ ملک کو صرف اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ اپنی شرافت اور اپنی بہادری کو محفوظ رکھ سکے (ظفر الوا، از آصفی)

کوئی انسان کیا ہے، ہمیشہ غیر معمولی حالات میں معلوم ہوتا ہے اور ان غیر معمولی حالات میں سب سے زیادہ نازک لمحہ وہ ہوتا ہے جب کہ آدمی فاتح اور غالب کی حیثیت میں ہو۔ اپنے کو فتح و غلبہ کے مقام پر پاکر بھی جو شخص شرافت اور انصاف پر قائم رہے وہی وہ انسان ہے جو امتحان میں پورا اترا۔

سچائی کی فتح

تیرھویں صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے جب کہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ کاندھلہ (ضلع مظفر نگر، یوپی) کی جامع مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاع شروع ہوگئی۔ یہ نزاع مسجد سے متصل ایک زمین کے بارے میں تھی۔ مسلمان اس زمین کو مسجد کی ملکیت قرار دے کر مسجد میں شامل کرنا چاہتے تھے اور ہندوؤں کا اصرار تھا کہ یہ قدیم مندر کا حصہ ہے۔ جھگڑا بڑھا تو معاملہ عدالت تک پہنچا اور کئی سال تک اس کا مقدمہ چلتا رہا۔

مجسٹریٹ انگریز تھا۔ جو شواہد اس کے سامنے پیش کئے گئے وہ اتنے قطعی نہ تھے کہ انکی بنیاد پر وہ کسی ایک فریق کے حق میں فیصلہ کر سکے۔ بالآخر مجسٹریٹ نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے الگ الگ گفتگو کی۔ اس نے مسلمانوں سے کہا کہ کیا تمھاری نظر میں کوئی ایسا ہندو ہے جو یہ گواہی دے کہ یہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔ اگر تم کسی ایسے ہندو کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ کر دوں گا۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم کسی ہندو کا نام نہیں بتا سکتے، یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور ہم کو کسی ہندو سے یہ امید نہیں کہ ایسے مذہبی معاملہ میں وہ جانب داری کے بغیر بالکل سچ بات کہہ سکے اور یہ گواہی دے کہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔

اس کے بعد انگریز مجسٹریٹ نے ہندوؤں کو بلایا اور کہا کہ کیا تم کسی ایسے مسلمان کا نام بتا سکتے ہو جو تمھارے دعوے کی تصدیق کرے اور یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ملکیت ہے۔ اگر تم ایسے کسی مسلمان کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ تمھارے حق میں کر دوں گا۔" ہندوؤں نے باہم مشورہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجسٹریٹ سے کہا کہ یہ مسئلہ قومی عزت کا معاملہ بن گیا ہے۔ اس لئے بہت مشکل ہے کہ کوئی مسلمان یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ہے تاہم ہماری بستی میں ایک بزرگ ایسے ہیں جن سے ہم کو امید ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔

ہندوؤں نے جس مسلمان کا نام بتایا وہ مولانا مظفر حسین کاندھلوی کے والد مولانا محمود بخش (م ۱۲۵۸ھ) تھے مجسٹریٹ کا کیمپ اس وقت کاندھلہ کے قریبی موضع ایلم میں تھا۔ اس نے فوراً مولانا محمود بخش کے یہاں پیغام بھیجا کہ وہ کچہری پہنچ کر متعلقہ مسئلہ میں اپنا بیان دیں۔ مجسٹریٹ کا بھیجا ہوا آدمی جب مولانا موصوف کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ فرنگی کا منھ کبھی نہیں دیکھوں گا۔ مجسٹریٹ نے دوبارہ اپنا چپراسی بھیج کر کہلایا کہ اس کا انتظام رہے گا کہ میں یا کوئی دوسرا انگریز آپ کے سامنے نہ پڑے۔ آپ مہربانی کر کے تشریف لائیں، کیونکہ آپ ہی کے بیان پر ایک اہم مقدمہ کا فیصلہ ہونا ہے۔ اس نے مزید کہلایا کہ آپ

کی مذہبی کتاب قرآن میں یہ حکم ہے کہ کسی معاملہ میں کسی کے پاس گواہی ہو تو وہ اس کو پیش کرے، وہ ہرگز اس کو نہ چھپائے۔

اب مولانا محمود بخش کاندھلوی مجسٹریٹ کی عدالت میں تشریف لائے۔ مجسٹریٹ خیمہ کے اندر دروازہ کے پاس بیٹھ گیا۔ مولانا دروازہ کے پاس باہر کی طرف کھڑے ہوگئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بڑی تعداد خیمہ کے باہر جمع تھی۔ ہر ایک ملے جلے جذبات کے ساتھ منتظر تھا کہ دیکھئے آج کیا پیش آتا ہے۔ اندر بیٹھے ہوئے مجسٹریٹ نے بلند آواز سے پوچھا کہ مولانا محمود بخش صاحب یہ بتایئے کہ یہ متنازعہ جگہ ہندوؤں کی ہے یا مسلمانوں کی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جگہ ہندوؤں کی ہے، مسلمانوں کا دعویٰ اس کے بارہ میں غلط ہے۔ مجسٹریٹ نے مولانا محمود بخش صاحب کے اسی بیان پر اپنا فیصلہ دے دیا اور وہ زمین ہندوؤں کو مل گئی۔ یہ زمین کاندھلہ کی موجودہ جامع مسجد کی جنوب مشرقی دیوار سے ملی ہوئی ہے۔ ہندوؤں نے مجسٹریٹ کے فیصلہ کے فوراً بعد یہاں مندر تعمیر کر دیا۔ اب بھی اس جگہ پر وہ مندر موجود ہے۔

مسلمان کچہری سے اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کے چہرے اداس تھے اور ان کے دلوں میں شکست کا احساس چھایا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ "مولوی نے قوم کو غیروں کے سامنے رسوا کر دیا" مسلمانوں کو معلوم نہ تھا کہ قانون کی عدالت کا فیصلہ اگرچہ ہو چکا ہے مگر اخلاق کی عدالت کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ مولانا محمود بخش کی اس سچائی اور بے لاگ حق پرستی کا ہندوؤں پر بہت اثر پڑا۔ وہ مولانا کی سچائی کے واقعہ میں اس دین کی سچائی کو دیکھنے لگے جس نے ان کے اندر یہ زبردست قوت پیدا کی کہ وہ ایک نہایت نازک قومی معاملہ میں بھی انصاف سے نہیں ہٹے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاندھلہ کے کئی ہندو خاندان اسلام سے متاثر ہوئے اور مولانا محمود بخش کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئے۔ ان نو مسلم خاندانوں میں سے ایک گھرانہ ۱۹۴۷ تک کاندھلہ میں موجود تھا جو تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا۔

مسلمان اپنا مقدمہ ہار گئے مگر اسلام اپنا مقدمہ جیت گیا۔

دو شخصوں یا گروہوں میں جب بھی کوئی نزاعی معاملہ پیش آتا ہے تو عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر ایک کی نظر مفاد اور مصلحت کی طرف چلی جاتی ہے۔ جس چیز میں بظاہر فائدہ نظر آئے، جو قومی وقار کے مطابق ہو۔ جس میں دنیوی سربلندی حاصل ہوتی ہو، آدمی بس اسی کی طرف جھک جاتا ہے۔ مگر حقیقی کامیابی کا راستہ یہ ہے کہ معاملہ کو حق اور ناحق اور انصاف اور بے انصافی کی نظر سے دیکھا جائے۔ جو طریقہ حق کے مطابق ہو اس کو اختیار کر لیا جائے اور جو طریقہ حق کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ اصولی موقف ہے اور اس دنیا میں بالآخر اصولی موقف کامیاب ہوتا ہے نہ کہ افادی موقف۔

مفاد کی قربانی

دور اول میں جنوبی اسپین کے بڑے حصہ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ اس علاقہ کو اصطلاحی طور پر اندلس کہا جاتا ہے۔ تاہم شمالی اسپین کا ایک حصہ ہمیشہ عیسائیوں کے پاس رہا۔ اس بنا پر دونوں قوتوں میں ہمیشہ ٹکراؤ اور مقابلہ کی صورت قائم رہتی تھی۔ گیارھویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں حالات بہت بگڑ گئے۔ مسیحی بادشاہ الفانسو (Alfonso VI) نے ۱۰۸۵ء میں طلیطلہ (Toledo) کو فتح کرکے اپنی طاقت بہت زیادہ بڑھالی۔ اس نے مسلم شہروں پر حملے شروع کر دیے۔ اس کے یہ حملے اتنے شدید تھے کہ یہ اندیشہ محسوس کیا جانے لگا کہ بہت جلد اسپین سے مسلم اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس وقت المعتمد بن عباد اسپین کے مسلم علاقہ کا سلطان تھا۔ اس کا دار السلطنت اشبیلیہ (Selves) تھا۔ اس کو بہت مشکل حالات میں حکومت کا نظام سنبھالنا پڑا۔ پڑوس کے مسیحی حکمراں نہایت بے رحمانہ طور پر مسلم علاقہ کی طرف اقدام کر رہے تھے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا اسپین دوبارہ مسیحی اقتدار کے تحت آجائے گا:

He was destined to rule in difficult times: neighbouring prices were resuming the inexorable advance that in time would bring all of Spain once again under Christian rule. (VII/138)

الفانسو نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد المعتمد سے اپنے سفیر کے ذریعہ خراج ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔ المعتمد نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مطالبہ کو تسلیم کر لیا اور اس کو خراج کی رقم بھیج دی۔ یہ خراج چاندی کے سکوں کی صورت میں تھا۔ مسیحی حکمراں نے چاندی کے سکے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اتنے ہی مقدار میں سونے کے سکہ کا مطالبہ کیا۔ اب المعتمد کو غصہ آگیا۔ اس نے مسیحی سفیر کو قتل کر دیا اور زر خراج کی رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

الفانسو اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایک متکبر بادشاہ تھا۔ مذکورہ واقعہ کے بعد وہ سخت برہم ہوا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اشبیلیہ پر حملہ کرکے نہ صرف اپنا انتقام لے بلکہ ہمیشہ کے لیے مسلم

سلطنت کا خاتمہ کر دے۔ ظاہری حالات کے اعتبار سے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب اسپین کی باقی ماندہ مسلم سلطنت بھی ختم ہو جائے گی۔ اور پورے ملک پر مسیحیوں کا قبضہ ہو جائے گا۔

حالات کی نزاکت کے پیش نظر المعتمد نے فیصلہ کیا کہ وہ مراکش کے طاقت ور سلطان یوسف بن تاشفین سے مدد طلب کرے۔ دوبارہ یہ ایک بے حد نازک معاملہ تھا۔ کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں یہ واضح اندیشہ تھا کہ الفانسو کی جگہ یوسف بن تاشفین اس کے ملک پر قابض ہو جائے گا۔ اس کے کچھ مشیروں نے سنجیدگی کے ساتھ اس اندیشہ کا اظہار کیا۔ المعتمد نے اس وقت اپنے مشیروں کو جو تاریخی جواب دیا وہ یہ تھا:

رعی الجمال ولا رعی الخنازیر۔ (لئن أكون اسیرا لدی ملك عربی مسلم أرعی له الجمال خیر من ان أكون اسیرا لدی ملك الافرنج أرعی له الخنازیر)	اونٹ کی چرواہی منظور ہے مگر خنزیر کی چرواہی منظور نہیں۔ اگر میں ایک عربی مسلم بادشاہ کا قیدی بن جاؤں اور اس کے اونٹوں کو چراؤں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ میں فرنگی بادشاہ کا قیدی بنوں اور اس کے خنزیروں کو چراؤں۔

اس کے بعد المعتمد نے سلطان یوسف بن تاشفین کو مدد کے لیے پیغام بھیجا۔ وہ افریقہ سے ایک بڑا لشکر لے کر روانہ ہوا۔ آبنائے جبرالٹر کو پار کر کے وہ اسپین میں داخل ہوا۔ اس وقت مسلم لشکر کی مجموعی تعداد ۲۰ ہزار تھی۔ اور مسیحی فوج کی تعداد ۵۰ ہزار سے زیادہ تھی۔ زلاقہ کے میدان میں دونوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ یہ رمضان کے مہینہ کا پہلا عشرہ تھا۔ مسیحی لشکر کو کثرتِ تعداد کے باوجود بری طرح شکست ہوئی۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ شدید مقابلہ میں خود المعتمد کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ اس دن اس نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ آخر میں فرنگی فوجوں میں سے صرف تین گھوڑے سوار اپنی جان بچا کر بھاگ سکے۔ مسلمانوں کو غیر معمولی مقدار میں مال غنیمت حاصل ہوا (۱۰/۱۵۴)

اس واقعہ کا ذکر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے ـــــــ ۱۰۸۶ء میں یوسف نے جبرالٹر کی آبنائے کو پار کیا اور زلاقہ کے مقام پر مسیحی فوجوں کو بری طرح شکست دی:

In 1086 Yusuf crossed the Strait of Gibraltar and at Zallaka inflicted a crushing defeat upon the Christian forces: (VII/138)

فتح کا یہ واقعہ بے حد اہم تھا۔ مسلمانوں کی حکومت اسپین میں اس وقت خاتمہ کے عین کنارے پہنچ گئی تھی۔ مگر اس فتح نے اسپین میں مسلم عہد کو چار سو سال مزید آگے بڑھا دیا۔

تاہم یہ عظیم سیاسی کامیابی ایک عظیم نفسیاتی قربانی کے ذریعہ ممکن ہو سکی۔ ایسا صرف اس وقت ہوا جب کہ سلطان المعتمد نے یہ قربانی دی کہ اس نے اپنے سیاسی مفاد کی پروانہ کرتے ہوئے یوسف بن تاشقین سے بلاشرط فوجی اتحاد کر لیا۔

زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ آدمی کو قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر فیصلہ لینا پڑتا ہے۔ جب تنگ نظری کے بجائے وسعت نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کوتاہ بینی کی جگہ دور بینی کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ جب اس عالی حوصلگی کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی چھوٹے مقاصد کو نظرانداز کر کے بڑے مقصد کے لیے آگے بڑھ جائے۔

ایک سچا مومن ایسے مواقع پر سب سے زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوتا ہے۔ مومن کا آفاقی مزاج اُس کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ چھوٹی باتوں میں اس طرح الجھے کہ بڑی بات کو وہ کھو دے۔ اس کی نگاہ ہمیشہ اعلیٰ مقاصد پر ہوتی ہے۔ اور جس انسان کی نظر اعلیٰ مقاصد پر ہو وہ کبھی چھوٹی باتوں میں الجھ کر اپنا راستہ کھوٹا نہیں کر سکتا۔

زندگی کے تمام فیصلوں میں اصل اہمیت مزاج کی ہے۔ صحیح مزاج کے لوگ صحیح فیصلہ لیتے ہیں اور غلط مزاج کے لوگ غلط فیصلہ کرتے ہیں۔ ایمان کسی آدمی کے اندر سب سے زیادہ صحیح مزاج بناتا ہے۔ ایمان آدمی کو صحیح ترین طرز پر سوچنے والا بنا دیتا ہے۔